افکارِ حسن

حسن عبداللہ حسنؔ

مُرتّب

پروفیسر نوشابہ صدیقی

افکارِ حسن
حسن عبداللہ حسنؔ
پروفیسر نوشابہ صدیقی

افکارِ حسن

حسن عبداللہ حسنؔ

مُرتّب

پروفیسر نوشابہ صدیقی

اشاعت : اگست 2007ء

نظرثانی : نثار اختر

ناشر : المبارک اکیڈمی

C-16 تھرڈ فلور، ہاشمی ٹرسٹ بلڈنگ، اُردو بازار کراچی

فون : 2620107

کمپوزنگ : محمد علی 0300-2696830

قیمت : -/200روپے

برائے رابطہ

ashernoor@gmail.com

انتساب

سو بار سوچوں، ہر بار یہی فیصلہ کروں

''اپنی امّاں کے نام جنہوں نے مجھے بیٹی بنائے رکھا''

زندگی کا آخری شعر کتاب کے پہلے صفحے پر

ہم زندگی کے واسطے مر جائیں گے حسنؔ
جب کوئی اور زیست کا ساماں نہ کر سکے



ہمارے والد۔ حسن عبداللہ حسنؔ

12 نومبر 1938ء کو یہ تصویر آرٹ پورٹریٹس لمیٹڈ لندن میں لی گئی



ہمارے دادا
حاجی مولوی ابوالحسن آئی ای ایس
(یہ تصویر کشمیر دربار میں لی گئی)

والد

مولوی ابوالحسن

- .... مولوی ابوالحسن ایم اے الٰہ باد یونیورسٹی
اقبال گولڈ میڈل اور گورنمنٹ اسکالرشپ حاصل کی
انگریزی ادب اور ریاضی میں امتیاز حاصل کیا
- .... ممبر آف کورٹ علی گڑھ یونیورسٹی
- .... اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن یو پی
- .... ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کشمیر
- .... انچارج ڈیوٹی سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- .... سکریٹری جناب نواب محسن الملک اور وقار الملک
ایم اے او کالج
- .... پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آپ حافظ قاری محمد علی کے صاحبزادے تھے جو صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ''کلیاتِ قاری'' کے نام سے فارسی میں مجموعہ کلام شائع ہوا۔

چند منتخب اشعار

لحد میں سوئے ہیں جاگے تھے عمر بھر کے حسنؔ
مگر یہاں بھی وہی انتظار باقی ہے

●

ہم اس مقام پر ہیں کہ دنیا کے شعبدے
بھائے مگر کبھی ہمیں حیراں نہ کرسکے

●

ہر شعر حسنؔ کا ہے سِرا پردۂ عرفاں
ہم سب سے بلند اس کی نظر دیکھ رہے ہیں

●

جو لطف مانگنے میں ہے پانے میں وہ کہاں
اپنی دُعا کے ساتھ نہ بھیجوں اثر کو میں

●

معاذ اللہ مرا صحرائے وحشت
حدودِ لامکاں سے جا ملا کیا ؟

●

یہ کیسا ہجومِ تمنا خدایا
مرا دل ہے آباد ویرانہ کردے



ہماری اماں

۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئیں، ۱۹۲۷ء میں شادی ہوئی، ۳۳ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔
۱۹۴۶ء سے لیکر ۲۰۰۰ء تک کا سفر اکیلے طے کیا۔ ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو ۸۷ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

حُسنِ ترتیب

حُسنِ ترتیب دوم

اشارے

اس کتاب کی ترتیب کے بارے میں مجھے آپ تک یہ بات پہنچانی ہے کہ میرے والد کا انتقال چالیس سال کی عمر میں ہو چکا تھا اور میں اس وقت اتنی ہی چھوٹی تھی کہ مجھے ان کی شبیہہ بھی یاد نہیں۔ فوراً ہی ملک تقسیم ہو گیا۔ ہمارا خاندان علی گڑھ سے غازی پور منتقل ہو گیا۔ جہاں ہمارا آبائی گھر ''حسن منزل'' موجود تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ہم پاکستان آ گئے۔

ہمیں اپنے سامان میں چند بکس تو یاد آتے ہیں جو ہمارے ساتھ آئے لیکن حسن منزل کی وسیع و عریض کتابوں سے بھری لائبریری۔ میرے والد کی ذاتی کتابیں۔ کاغذات، کلام، تقاریر وغیرہ کا مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں رہ گئیں۔ کراچی میں میرے دادا نے جو بعد میں پاکستان آئے تھے کچھ کاغذات میرے حوالے کیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے ہی کیوں دیے کہ اس وقت بھی میری عمر کچھ بھی سونپے جانے کے قابل نہ تھی اور مجھ سے بڑے بھائی بہن اور خاندان کے ذمہ دار افراد موجود تھے۔ ہاں ان کاغذات کو میرے حوالے کرتے ہوئے ان کا جملہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اس کی قدر تم سے زیادہ اور کوئی نہیں کرے گا'' اس جملے نے جہاں مجھے بے پناہ اعتماد بخشا تھا وہاں بڑوں کو خاصا دھچکا بھی لگا تھا۔ مگر میرے لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے کسی نے بھی با آوازِ بلند مخالفت نہیں کی اور مجھ پر ذمہ داریوں کا پہاڑ آ ٹوٹا۔

ان کاغذات میں زیادہ تر دستاویزات خود ان سے متعلق تھیں۔ وہ اپنے دور کے بڑے آئی ای ایس افسر تھے، اقبال گولڈ میڈلسٹ تھے، اسکالرشپ ہولڈر تھے، بڑے بڑے تعلیمی عہدوں پر فائز رہے تھے، بڑے بڑوں کے ساتھ کام کیا تھا۔ جن میں وقار الملک، محسن الملک، ڈاکٹر سلیمان اشرف اور علی گڑھ یونیورسٹی کے ٹرسٹی صاحبان شامل تھے۔ جن کی ہاتھ کی تحریریں۔ ان انگریز حکمرانوں کی ان کے بارے میں رائے شامل ہے جو ایم اے او کالج یا ہندوستان کے علمی اور تعلیمی اُمور سے متعلق تھے۔ ان صفحات میں میرے دادا کی صفات اور قابلیت کا عکس موجود ہے

اور جو تقریباً ڈیڑھ سو سال پُرانی دستاویزات ہونے کے سبب اب بُھربُھرے پن کا شکار ہوتی جارہی ہیں۔ افسوس ان پر کسی نے کام نہیں کیا اور وہ تاریخ کی بیشتر بڑی شخصیتوں کی طرح زمانے کی گرد میں معدوم ہو جائیں گے۔ مجھ میں اتنا بڑا تحقیقی و تخلیقی کام کرنے کی صلاحیت نہیں اور ان کے زمانے کے کسی شخص کا موجود نہ ہونا وہ مقام بھی نہ ہونا جہاں وہ رہے۔ میں بھلا کیا کر پاؤں گی مگر ہاں ان کاغذات میں میرے والد کی اسناد ایک عدد پاسپورٹ اور چند تقاریر کے مسودے بھی تھے۔ پاسپورٹ سے تاریخِ پیدائش ملی۔ ڈاکٹریٹ کرنے کے سلسلے میں جو بیرونی سفر کیے اس کی معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ وہ مشاعروں کے علاوہ جلسوں میں بحیثیت صدر اور مقرر مدعو کیے جاتے۔ موضوع زیادہ تر علمی اور مذہبی ہوتا۔ وہ جوشیلے مقرّر تھے اور اسلام ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ان کاغذات کے علاوہ اور کچھ نہیں سوائے ایک نظم کے جو میری دادی نے اس غلافِ کعبہ کی زیارت کے موقع پر لکھا تھا جو کبھی زیارت کے لیے ہندوستان آیا تھا اور جسے دیکھنے کی انہیں سعادت حاصل ہوئی تھی اور ایک ایسا اشارہ کہ انہوں نے غازی پور میں عطیہ بیگم فیضی سے ملاقات کی تھی اور ان سے پردے کے موضوع پر بحث کی تھی باقی سب کچھ مجھے کہاں سے ملا مجھے نہیں معلوم کہ غیب سے میرے اس قیمتی خزانے میں ان کا کچھ کلام مجھ تک آ گیا۔ کچھ کاغذات مشفق خواجہ نے ڈرامائی انداز میں مجھے دیئے۔ میں نے وہ سب یوں سنبھالا کہ رکھ کر بھول گئی لیکن یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ میرے والد مجھ سے کچھ اُمید رکھتے ہیں اور مجھے ان کا یہ کام کرنا ہے۔ دیر ہو گئی ان کے جاننے والے اپنی پوری عمر گزار کر ان تک پہنچ گئے۔ کاش میں نے ان سے کچھ ان کے بارے میں لکھوا لیا ہوتا۔ خصوصاً ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر احسان رشید، منظر عالم ایڈووکیٹ سے لیکن میں نے ایک نالائق اولاد کا ثبوت دیا۔ اب اپنا جرم دھندلا کرنے کے لیے اپنی سرکاری ملازمت سے فراغت کے بعد ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہ کام شروع کر دیا۔ اس کام سے پہلے مر جاتی تو اپنے والد کا سامنا دُشوار ہوتا۔ اب روزِ محشر میری جب ان سے پہلی ملاقات ہو گی تو شرم سے میں نظریں جھکانے کے بجائے ان کے اس حسین پیکر کو دیکھنے کی سکت رکھوں گی جو وہ رکھتے تھے۔

- ہمارے پاس دستیاب غزلوں کے مطابق ان کا پہلا کلام 1922ء کا ہے جب ان کی عمر صرف سترہ برس تھی۔

آپ سے وصل اگر مرضیٔ تقدیر نہیں
صبر کرنے کے سوا کوئی بھی تدبیر نہیں

سارا کلام ایک جیبی سائز کی ڈائری۔ایک کاپی کے چند اوراق، چند بکھرے صفحات، تین شائع شدہ مثنوی اور ایک اور ڈائری جس میں خاندان اور جاننے والوں کی پیدائش، وفات، مختلف مواقع پر، برجستہ قطعے درج ہیں۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تاریخ نکالنے پر عبور حاصل تھا۔

- کچھ ایسے کاغذات ہیں جن پر آل انڈیا ریڈیو کے مشاعروں میں شرکت کے اشارے ہیں اور زیادہ تر صفحات پر بکھری تحریر ان تقریروں کے نکات ہیں جو انہیں ہندوستان کے مختلف شہروں کے جلسوں میں بحیثیت مقرر یا بحیثیت صدر کرنی تھیں۔ موضوعات زیادہ تر مذہبی، سیاسی، ادبی اور تاریخِ عالم پر مبنی ہیں۔ کچھ تحریکِ پاکستان کے اشارے اور قائد سے عقیدت کے ثبوت۔
- چونکہ ان کے انتقال کے 60 سال بعد یہ تحریر اشاعت پذیر ہو رہی ہیں لہٰذا صفحات جڑ گئے ہیں۔روشنائی دھندلی پڑ گئی ہے اور باوجود بے حد خوبصورت لکھائی کے پڑھنے میں نہیں آ رہی ہیں۔
- ہر غزل پر تاریخ، مہینہ، سال، وقت اور موقع درج ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کب کس شہر میں رہے اور کس موقعے اور کس کے کہنے پر غزل لکھ رہے ہیں۔
- بیشتر غزلیں مصرع طرح پر ہیں۔ اشتعال دلانے۔ درخواست پر ہیں اور بعض دوبارہ اشتعال دلانے پر۔جس سے اس زمانے کا مزاج سمجھ میں آتا ہے۔
- یونیورسٹی، یونین اساتذہ، انتخابات، دعوتیں اور مختلف محفلوں پر لکھی گئی نظمیں اس بات کی غماض ہیں کہ انہیں ہر تقریب میں کس قدر مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔
- اگر چہ وہ فارسی کے ایم اے نہیں تھے لیکن فارسی کے بھی اُستاد تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

انہیں فارسی زبان پر دسترس حاصل تھی۔ ان کی کئی نظمیں بھی فارسی میں موجود ہیں۔ جو میری کم علمی اور سیاہی کے معدوم ہو جانے کے سبب پڑھنے میں نہیں آ رہی ہیں۔ اس لیے وہ شامل نہیں ہیں۔

اسی سبب بعض لفظ زبر زیر اور مصرعے میں نے اندازے سے لکھے ہیں جس میں غلطی کا احتمال موجود ہے۔

- اشعار بعض جگہ اصلاح اور ترتیب بھی چاہتے ہوں گے مگر ان کی زندگی موت سے جلد جا ملی اور وہ اس کی اصلاح نہ کر سکے۔
- اگر اپنی زندگی میں وہ اپنا دیوان مرتب کرتے تو اس کا نام افکارِ حسن ہی رکھتے۔ اس بات کا اشارہ ان کی ڈائری کے پہلے صفحے سے ظاہر ہے۔
- اپنی زندگی میں وہ نہ صرف اپنے آبائی شہر غازی پور کے علاوہ بارہ بنکی، آگرہ، جھانسی، اٹاوہ، الٰہ باد، شملہ، مسوری، نینی تال، علی گڑھ اور دیگر شہروں میں بے پناہ شہرت اور عزّت رکھتے تھے۔
- ان کے انتقال پر کانفرنس گزٹ جو علی گڑھ سے نکلنے والا اخبار تھا انتقال کی خبر کے علاوہ ان کا کلام اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون اس میں شائع ہوا جو بعد میں گنج ہائے گرانمایہ میں شامل ہوا۔
- اٹاوہ سے شائع ہونے والے البشیر اخبار کے ایڈیٹوریل میں ''ایک جوان صالح کی موت'' کے عنوان سے مدیر کی درد بھری تحریر شائع ہوئی۔
- سوئم پر یونیورسٹی کے طالب علموں کی جانب سے ایک صفحہ بانٹا گیا جس میں ان کے خاندانی پسِ منظر اور ان کی اپنی خوبیوں پر مبنی تحریر شائع کی گئی۔
- مسلم یونیورسٹی کورٹ کی قرارداد شائع شدہ بھی موجود ہے جس کی صدارت ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے کی۔

- جن جن اداروں میں انہوں نے تعلیم حاصل کی وہاں کے اساتذہ نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے ان کی شخصیت کا بآسانی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ کچھ صفحات ہم تک پہنچے اور جس سے ہم نے استفادہ کیا۔
لیکن اس کے علاوہ کہاں کہاں تعزیتی جلسے ہوئے۔ کیا کیا اور کہاں کہاں چھپا اور ان کے بارے میں کیا کیا کہا گیا وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔
- ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ جو مکمل تھا۔ اور لندن کے اورینٹل کالج میں کچھ جمع تھا اور کچھ جمع ہونا تھا جانے کہاں ہے۔ یہ محنت بس یونہی ضائع گئی۔
- ان کی ذاتی رہائشی زمین اب علی گڑھ کے میڈیکل کالج میں شامل ہو چکی ہے۔ جس کی افتتاحی تقریب میں انہوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین کی کوششوں پر منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ ہم پسماندگان اپنے حصے کی زمین کے اس استعمال پر خوش ہیں۔
- مجھ پر یہ اعتراض یقیناً کیا جا سکتا ہے کہ میں نے ان کے کلام کا انتخاب نہیں کیا۔ یا یہ کہ دیگر چیزیں بھی اس میں شامل کر دیں جو کسی مجموعۂ کلام میں نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے معاف کیا جائے کہ میرا مقصد ان سے متعلق تمام قابلِ ذکر تحریروں کو محفوظ کر دینا اور کتابی شکل دینا تھا کہ اسے اپنی آئندہ نسلوں تک پہونچا دوں۔

اصلی کاغذات تو میری آنکھوں کا سُرمہ ہیں کہ مجھے ان میں ان کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوتا ہے۔ جب تک جی رہی ہوں اسے چھو کر انہیں محسوس کرتی رہونگی۔ بعد میں تو ان صفحات کو خاک اور خواب ہی ہو جانا ہے کہ زمانے کی دست و بُرد سے کیا۔ اور کون محفوظ رہا ہے۔

مُرتّب

پروفیسر نوشابہ صدیقی

زیرِ لب

میں سمجھتی ہوں کہ ہر بچے کا یہ پیدائشی حق ہوتا ہے کہ وہ جب دنیا میں آئے تو اس کے دائیں اور بائیں ہاتھ تھام کر چلانے والے دونوں افراد جو ماں اور باپ کہلاتے ہیں ضرور موجود ہوں۔ بچہ باپ کا نام اپنے نام کے ساتھ ملا کر اس کے شجرۂ نسب کا حصّہ بن جاتا ہے اور یہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ ماں سے وہ زندگی کے ضروری کام سیکھتا ہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو تو کیوں نہ ہو؟ یوں تو اللہ کے ہر فیصلے کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ مصلحت کا علم انسان کو ہو۔ کیونکہ انسان کا علم ناقص ہوتا ہے۔ پھر بھی مجھے یہ جاننے کی زندگی بھر کرید رہی کہ آخر میرا دایاں یا بایاں ہاتھ پکڑ اکر چلانے والا میرا باپ کیوں نہیں ہے۔ میں نے زندگی بھر اس بات کا شکوہ اپنے اللہ سے کیا ہے اور کرتی رہوں گی کہ اس کمی نے زندگی کا سب سے خوبصورت اور دلکش احساس مجھے محسوس ہونے نہیں دیا۔

میں دنیا میں آئی۔ میرا نام میرے باپ نے دیا بلکہ میری تاریخِ پیدائش درج کرتے ہوئے اپنی ڈائری کا ایک پورا صفحہ میرے نام کیا اور لکھا یہ بیٹی ''نخلِ باغِ آرزوئے دل ہے'' مگر پیشتر کہ بیٹی یہ جملہ پڑھنے کے قابل ہوتی یا بیٹی کی آنکھیں اسے پہچانتیں۔ انگلیاں اسے ٹٹولتیں۔ اس کی خوشبو سے لپٹتی۔ وہ شخص ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اُوجھل ہو گیا۔ بعض لوگ بعض کام بہت غلط وقت پر کرتے ہیں میرے باپ نے بھی اپنے لوٹ جانے کا وقت غلط چُنا۔ ہندوستان تقسیم ہو رہا تھا۔ ایک نیا ملک بن رہا تھا۔ جس کے بننے میں اس نے بحثیت طالبعلم جدو جہد بھی کی تھی۔ صدیوں سے آباد اس کا خاندان ہجرت کر کے اس نئے ملک میں آ گیا۔ مجھے اس کی بھی شکایت نہیں کہ زمانہ اکثر قیامت کی چال چلتا ہے۔ مجھے معاشرتی اور معاشی ناہمواریوں کی بھی کوئی شکایت نہیں۔ وہ محل دو محلے۔ وہ باغ، کھیت، کھلیان وہ عہدے، پیشے، شناخت پہچان سب سرحد کے اس پار رہ گئی اور یہاں بس ہم اپنا ذاتی نام لے کر ایک نئی شناخت بنانے کے لیے آ گئے۔ مجھے

ان محلوں دو محلوں سے واقعی کوئی لگاؤ نہیں۔ مگر میں ان دیواروں میں رچی بسی اس خوشبو کو سونگھنے کا تو حق رکھتی تھی جو میرے خاندان کی خوشبو تھی۔ میں اس چھت کے نیچے رہ کر کچھ خواب تو دیکھ سکتی تھی وہ آوازیں دالانوں اور صحن میں کہیں نہ کہیں تو موجود ہوں گی۔ انہیں سنتی، وہ آسمان، وہ زمین، وہ موسم تو میں ضرور محسوس کرنا چاہتی تھی جہاں سے میرا خمیر اُٹھا تھا۔ میں اس چاند سے باتیں کرنا چاہتی تھی جو میرے آنگن میں روز اُترتا تھا۔ میں ان ستاروں کو اپنے آنچل میں سمیٹنا چاہتی تھی جو ساری رات جلتے بجھتے تھے وہ شاید مجھ سے باتیں کرنا چاہتے رہے ہوں۔ میں ان کتابوں کا پیوں اور دیگر اشیاء کو ہاتھ تو لگاتی جس کا لمس میرے لوگوں کا لمس تھا۔ کچھ ورثے میرے لیے تھے اسے مجھے اپنے نام کرنا تھے۔ کچھ تحریریں جو شاید میرے نام ہوتیں۔ جنہیں میں پڑھنا چاہتی تھی۔ میرے آنگن کے درخت جن پر آم، جامن، شریفے، امرود، گکروندے اور دوسرے پھل لگتے جو ہمارے صحن میں برسوں سے ایستادہ تھے۔ مجھے ان پھلوں کو چکھنا تھا۔ ان کی شیرینی ان کا کھٹا پن، ان کا کچا پن مجھے ان سب کا مزہ لینا تھا۔ مجھے نیم اور پیپل کے سائے میں بیٹھنا تھا۔ مجھے موگرے، گلاب کی کیاری میں پانی دینا تھا۔ رات کی رانی اور ہار سنگھار کے پھول صبح سویرے چاندی کے کٹورے میں بھرنے تھے۔ کچے صحن کے چھڑکاؤ کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے اپنے وجود میں سمونی تھی۔ گھڑونچی پر رکھے ہوئے مٹکے اور صراحی جو چنبیلی کے پھولوں کے ہار پہن کر صحن کی شان بڑھاتے تھے ان کا پانی چاندی کے اس کٹورے میں پینا تھا جو اس پر اوندھا کر رکھے جاتے۔ زنجیر والی کنڈی کو ہلا ہلا کر بجانا تھا، خوش ہونا تھا، رونا تھا، سونا تھا، مجھے حسن منزل کو اپنی ملکیت کہنا تھا اپنے آنگن کے کنوئیں میں اپنا عکس دیکھنا تھا۔ مجھے آبائی حویلی کی دیوار پھلانگ کر گنے کے کھیت، آم کے باغ، سنگھاڑے کے ڈھیر دیکھنے تھے۔ مجھے غازی پور اور علی گڑھ کی تمام روائیتوں کو محسوس کرنا تھا تو کیا یہ سب کچھ میرا حق نہ تھا۔ مگر محسوس کرنے سے پہلے میں وہاں سے جدا کر دی گئی۔ میں آج تک اس فیصلے کو پورے طور پر قبول نہیں کر پائی۔ میں ہجرت کرتی۔ میں ضرور یہاں آتی۔ میں پاکستان کو ہی اپنا وطن بناتی۔ لیکن اپنے کیے ہوئے فیصلے کے بعد۔ میرے لیے جس نے بھی یہ فیصلہ کیا مجھے زندگی بھر اس سے شکایت رہی اور رہے گی۔ میری زندگی سے جڑے سارے فیصلے دوسروں نے کیے۔ غلط وقت پر کیے اور مجھے نظر انداز کر کے کیے۔ اور یہ دوسرے مجھے کبھی اچھے

نہیں لگے کیونکہ وقت نے ثابت کیا کہ یہ لوگ میرے تھے ہی نہیں۔

میری عمر صرف چند سال کی تھی مجھے نہ اپنے نام کی ہجے آتی تھی نہ مفہوم کہ مجھے تو اسی عمر سے اپنے آپ جینے کا قرینہ سیکھنا تھا۔ اماں جائے نماز پر بیٹھی اللہ سے جانے کیا کیا باتیں کیا کرتیں۔ چھوٹے بھائی اور بڑی بہن سب ہی کٹی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر کسی نہ کسی چھت۔ کسی درخت کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔ میں نے اسی عمر سے خواب دیکھنے شروع کیے۔ میرے خواب کی ابتدا میں میری کسی اپنی خواہش کے بجائے ضرورت کا دخل تھا۔ اور ہر ضرورت کا سرا اپنے باپ سے جا کر جُڑ جاتا۔ مجھے پڑھنا تھا، نام کمانا تھا، خاندان کے بنائے ہوئے اُصولوں کو برتنا تھا۔ اور بس اپنے آپ کو سڑک کے اس کے کونے تک پہونچانا تھا جہاں میرا خیال تھا کہ میرے ابا کھڑے ہوں گے۔ اور جب میں سڑک پار کر کے ان تک پہنچوں گی تو وہ مجھ سے پوچھیں گے۔ تم نے کیا پڑھا ہے۔ تم نے آج تک کیا کیا ہے؟ میں اپنے جانتے میں سارے وہ کام کر رہی تھی جو کام انہیں پسند آ سکتے تھے۔ چونکہ کوئی خوبی مجھ میں اللہ کی طرف سے، ودیعت نہیں ہوئی تھی اس لیے جو کچھ بھی کیا بس یونہی سا کیا۔ لیکن یہ بات کبھی نہیں بھولی کہ میرے ابا کا نام حسن عبداللہ ہے جو کم عمری میں انتقال کر گئے اور جو اپنے عہد اور اپنے شہر کے نامی گرامی شخص تھے۔ جو لوگوں کے دلوں میں بستے تھے جن کی خوبیوں سے ہر شخص واقف تھا۔ اور ہر محفل میں ان کا تذکرہ تھا۔ ہر بڑا اور چھوٹا انہیں جانتا تھا۔ اور ان کے لیے اچھے جذبات و الفاظ رکھتا تھا۔ میں اسی غرور کو لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سیڑھیاں چڑھتی عملی زندگی میں آ گئی۔ معاشیات پڑھی۔ پڑھائی۔ ادب پڑھا۔ صحافت میں چکر لگایا۔ تحریر و تقریر اور پھر ایک درسگاہ میں جا کر پناہ ڈھونڈ لی۔ زندگی کے چالیس سال اسے دے دیے۔ ایسے دیے کہ وہ زندگی کا جز و نہیں بلکہ میری زندگی ہی بن گئے۔

ان سب دنوں کے گزارنے میں یہ توفیق نہ ہوئی کہ باپ کی ہاتھ آئی ایک نامکمل ڈائری پر کچھ کام کر ڈالوں۔ فرصت کے رات دن تلاش کرتی رہی جو نہ ملے۔ شادی اور بچوں نے میرے چوبیس گھنٹوں میں سے پچیس گھنٹوں پر قبضہ کر لیا۔ دراصل میں بنیادی طور پر صرف ایک عورت تھی۔ گھر شوہر اور بچے میری چاہت کی تکون تھے۔ میں نے اپنا رات دن ان پر لٹا دیا اور اب۔ اب جب کہ تمام ذمہ داریاں نبھا چکی تو بہت سا پانی پُلوں سے بہہ چکا تھا۔ وہ سب لوگ جو میرے

ابا کو جانتے تھے ان سے ملنے ان کے پاس چلے گئے۔ ان پر لکھنے والا اور ان پر بولنے والا کوئی نہ بچا۔ وہ سارے خاندانی رشتے جن میں میری تین پھوپھیاں اور میری ماں شامل تھیں جو میری زندگی کا محور اور عزیز از جان تھیں وہ بھی چلی گئیں۔ یہاں میں کہدوں میں ان سب کی گنہگار ہوں۔ کاش جو کچھ میں آج کرنے چلی ہوں ان کی زندگی میں کر لیتی تو میں اپنی پھوپھیوں کی گود میں سمٹ کر خوب روتی اور وہ ہمیشہ کی طرح مجھے اپنے بانہوں میں بھر کر اتنی گہری سانسیں لیتیں کہ میں ان سانسوں کے ذریعہ اپنے ابا کے لمس کو محسوس کر لیتی۔ اپنی اماں کے ہاتھوں میں یہ کتاب پکڑاتی تو میری اماں اپنے دن بھر نمازوں اور تسبیح سے جو چند لمحوں کا خالی وقت پاتیں تو یہ کتاب سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتیں۔ اپنی جوانی کے وہ چند سال یاد کرتیں جو انہوں نے میرے ابا کے ساتھ گزارے تھے۔ اور پھر آنکھیں کھولتیں جو بھی سامنے ہوتا کہتیں۔ دیکھا میری بیٹی کو، ابا کی لاڈلی کو، اس نے ہی وہ کام کیا جو اور کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر بتاتیں۔ تمہیں ابا بہت چاہتے تھے۔ ہر وقت گود میں لیے ہوتے مجھ سے کہتے اسے مجھے دے دو۔ بس یہ میری ہے۔ میں کہتی اور بھی تو بچے ہیں اس میں کیا خاص بات ہے۔ تب وہ کہتے۔ ''میری آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں وہ تم نہیں دیکھ سکتیں۔'' میں شرما جاتی، میں ڈر جاتی، ہائے ابا مجھ میں کیا دیکھ رہے تھے کیا دیکھنا چاہتے تھے۔ میں انہیں کتنا مایوس کر رہی ہوں۔ میں نے انہیں کتنا دُکھ دیا ہوگا۔ میں نے محبت کا وہ سارا زمانہ گزار دیا۔ اب کوئی بھی نہیں۔ بس میرے اور میرے لوگوں کے بچے ہیں۔ کیا وہ میری قربانیاں سمجھیں گے کہ میں نے اپنے ابا کا وقت بھی ان پر وار دیا۔ اور کیا وہ اپنا وقت مجھ پر گزاریں گے۔ شاید نہیں کہ نسلیں ترقی کر رہی ہیں۔ سمجھ دار ہو گئی ہیں کہ ترقی میں پیچھے نہیں آگے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو وقت دیں گے کہ ہم تو گزرا زمانہ ہوں گے۔ آہ سارا زمانہ ہمارے ہی عہد میں بدلنے کو رہ گیا تھا۔

چلیے آگے بڑھیے آپ مجھ سے پوچھیے تو سہی میرے ابا کا یہ کلام میرے ہاتھ کیسے آ گیا؟ میں تو اپنے آپ سے بھی یہ پوچھتی ہوں کہ میری ولدیت ہندوستان سے سفر کرتے وقت مجھ سے کسی نے چھین کیوں نہ لی۔ جیسے میرے باپ کے محلے دو محلے۔ زمینیں، جائیداد، باغ، کتابیں، کپڑے، تصویریں، میرا بچپن۔ غرض کہ میری زندگی، میرا بھرا پُرا گھر۔ میں نے کئی گھروں میں

اپنے باپ کے نام سے جُڑی چیزیں دیکھی ہیں۔لوگ استعمال کررہے ہیں۔میرے مکان پر اپنے نام کا بورڈ لگائے ہوئے ہیں۔کسی نے بھی یہ نہیں کہا یہ تمہارے ہیں۔تمہارے باپ کے ہیں۔وہ صرف یہ اقرار کرلیتے ہم ان سے یہ سب کچھ چھین تو نہ لیتے۔چند بوسیدہ کاغذات، پاسپورٹ، مختلف سندیں، تحریریں، شاعری کے صفحات اور ایک بالشت برابر ڈائری جس کے صفحات کبھی شاید سفید رہے ہوں اب زمانے کی پیلاہٹ کا شکار ہیں۔مجھے خواب میں یہ تمام چیزیں کسی فرشتے نے چپکے سے دے دیں۔اور میں نے انہیں اس طرح سنبھالا کہ پھر خود بھی کبھی کھول کر نہ دیکھا۔ ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوئی تو اسے یوں تھامے رکھا جیسے یہ ابھی ابھی پیدا ہوا میرا بچہ ہے۔ اور سواری میں بیٹھ کر یہ دُعا مانگ کر دوسرے گھر تک کا سفر پورا کیا کہ راستے میں کوئی حادثہ نہ ہوجائے۔میں ان کاغذات سے محروم نہ ہوجاؤں کہ پھر تو میں بالکل ہی مفلس ہوجاؤں گی۔میں تو بس مرہی جاؤں گی۔واقعی میں نے محسوس کیا کہ پھر ہرگز جی نہیں پاؤں گی۔یہ کاغذات ہمیشہ میرے پاس حفاظت سے رہے اتنی حفاظت سے کہ میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں۔بس یہ عہد دل ہی دل میں ہمیشہ رہا کہ ایک دن میں اسے ترتیب دے کر''افکارِ حسن'' نام دوں گی۔شاید وہ وقت اللہ نے اب ہی رکھا تھا کہ میں جیتی رہی صدی بدل گئی اور میری ماں مرگئی۔

''افکارِ حسن'' کی ترتیب میں صفحات پلٹتے وقت میری انگلیوں کی تھرتھراہٹ، میرے دل کی دھڑکنیں اور میری آنکھوں کی برسات۔میں شاید ان کٹھن لمحوں کا بیان الفاظ میں ڈھال نہیں پاؤں گی۔

کاغذات کا ایک دوسرے سے چپکنا دراصل اس پر وقت گزرنے کی داستان سے متعلق ہے۔حرف مٹ گئے ہیں۔مگر ہر تحریر ہر غزل سے پہلے مقام، موقع، شہر، تاریخ اور کس کی فرمائش پر لکھا گیا اس طرح درج ہے کہ بند آنکھوں سے کہانی کی روانی پڑھی جاسکتی ہے۔وہ کب کہاں کس کس سے ملے، کس کے کہنے پر لکھا، کس موقعے پر لکھا، کس شہر میں گئے، کب کب ہم سے دُور رہے۔کتنی داد پائی یہ تو ہم نہ جان سکے لیکن اس زمانے کی شاعری کے معیار سے اس کے معیار کو ملایئے اور پھر فی البدیہہ شاعری کو مدِّ نظر رکھ کر ان کی شعر گوئی پر بلا کی گرفت کو محسوس کریں۔وقت نے مہلت دی ہوتی تو آج تک ان کی زندگی میں کتنے مجموعے آئے ہوتے۔کتنی تنقیدی کتابیں

چھپتیں۔ان کا ادب میں یقیناً کوئی مقام بن چکا ہوتا۔مگر جانے کی جلدی میں بس وہ اپنی یہ چھوٹی سی ڈائری چند چھپے ہوئے کاغذات اور کچھ ادھوری تحریریں چھوڑ گئے۔یا ہوسکتا ہے کہ وہ اور بھی بہت کچھ چھوڑ گئے ہوں۔اپنے وسیع گھر کی عظیم لائبریری میں ان کی ذاتی کتنی ہی تحریریں دب کر رہ گئی ہوں اور ہم تک پہنچنے سے قاصر رہ گئی ہوں ان کی چیخیں مجھے بار ہا سنائی بھی دی ہیں لیکن ملبے میں دبی زندگی زیادہ دیر زندہ کہاں رہتی ہے؟

میں ان بُری اولاد میں سے ایک ہوں جس نے اپنے باپ کی قبر تک نہ دیکھی۔ان کی گزر گاہوں پر چل کر قدم پر اپنے قدم بھی نہ رکھے۔اس شہر کو بھی نہ دیکھا کہ جس سے انہوں نے عشق کیا اور جہاں وہ آسودہ خاک بھی ہو گئے۔میں شاید آج بھی اس ملک جاؤں،اس شہر جاؤں، علی گڑھ جاؤں،اس گھر جاؤں،یونیورسٹی کے قبرستان میں اس قبر کے سرہانے کھڑی ہوں تو اپنے آنسوؤں کے سمندر میں غرق نہ ہو جاؤں کہ میں بھی تو اپنے ان دیکھے ابا کے عشق میں دیوانی ہو چکی ہوں۔میں ایسا عشق پھر کسی سے نہ کر پائی۔اپنی ماں سے بھی نہیں جو اگر میری زندگی میں دیر تک نہ ہوتیں تو میں اللہ سے باغی ہو جاتی اور کفر بکنے لگ جاتی۔اپنے شوہر اپنے بچوں سے بھی نہیں،اپنی پھوپھیوں سے بھی نہیں،اپنی بہن اور اپنے بھائیوں سے بھی نہیں،اپنے دوستوں سے بھی نہیں جو میری زندگی میں مجھے جینے کا بھرپور حوصلہ دیتے ہیں۔اور میں جنہیں بہت بہت چاہتی ہوں۔لیکن میں اپنی ان تمام چاہتوں کا مقابلہ اس شخص کی چاہت سے کیسے کروں جو میری زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں اور میری ساری زندگی اپنے ساتھ لے گیا۔ساری چاہت اپنے نام کرا گیا۔

اس نے مجھے اپنا نام دیا شناخت دی میں اس کی شکر گزار ہوں۔اس نے مجھے اپنا جیتا جاگتا وجود اور پھیلی ہوئی بانہیں اور اپنی گود نہیں دی۔آج میں ان تمام محرومی کے باعث جس قدر کم علم اور کم سمجھ ہوں اس کی ہی مطابقت سے اپنا چھوٹا سا دیر سے کیا ہوا کام ''افکارِ حسن'' کے نام سے اس کے حضور پیش کر رہی ہوں۔اس کی ''نخلِ باغِ آرزوئے دل'' ہونے کا دعویٰ ہے مگر ایک ایسی کام چور اور نالائق طالب علم کے طور پر جس نے اپنا ہوم ورک وقت پر نہیں کیا۔میں اپنے ابا سے مخاطب ہوں۔

''سینٹ جانس کالج آگرہ کے پروفیسر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کنٹرولر اور اسٹیوارڈ حسن عبداللہ صاحب آپ جو بھی سزا اس کے لیئے تجویز کریں آپ کی اس نالائق بیٹی کو بسر و چشم قبول ہے۔ مگر میرے ابا ''افکارِ حسن'' کو میرے ہاتھوں سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیجیے اس میں باقی رہ جانے والی غلطیوں کو نظر انداز کر دیجیے اس بات کی داد دیجیے کہ وقت کی بہت پابند آپ کی بیٹی نے بہت وقت گزر جانے کے بعد بھی آپ کے افکار کو بے نشان نہیں چھوڑا۔ ذرا سا مسکرا دیجیے۔ اور میری ماں سے کہئے جنہیں میں نے اپنے ہاتھوں سے نہلا دھلا کر اور سفید لباس پہنا کر آپ کے پاس بھیج دیا ہے کہ ان کی منی نے آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام کر دیا ہے۔ میں ان کا جواب جانتی ہوں وہ کہیں گی ''یہ کام تو صرف میری منّی ہی کر سکتی تھی'' بس یہی تو میری محنت کی اُجرت ہے۔ مگر ابا آپ میری زندگی بھر کے اس واحد کارنامے پر مجھے کس طرح داد دیں گے کہ میں تو آپ کو جانتی ہی نہیں اور ساری زندگی اسی خواہش میں گزار دی کہ میں آپ سے ملی ہوتی اور آپ کو جانتی آپ نے جتنی زندگی گزاری اس میں میں نہیں تھی۔ اور جو زندگی میں نے گزاری اس میں آپ نہ تھے۔ مگر شجرۂ نسب کہتا ہے کہ ہم باپ بیٹی تھے۔ آپ نے مجھے نام دیا آج میں آپ کو اپنا کام دے رہی ہوں آپ کے مرتبے سے بہت کم اور میری صلاحیتوں کے مقابلے میں بڑا کام۔ آپ کے افکار آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں قبول کیجیے۔

رشید احمد صدیقی

حسن عبداللہ

سائرن بے وقت بجا۔ دل دھک سے ہو گیا۔ حسن عبداللہ رحلت کر گئے۔ صرف چند لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ دفعتاً بیمار ہو گئے تھے ورنہ یونیورسٹی کے احاطہ میں کسی شخص کے ذہن میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ حسن عبداللہ کی وفات کا اعلان کیا گیا تھا۔ کوئی مر سکتا تھا، سوا حسن عبداللہ کے، وہ ایسے کڑیل جوان تھے۔ جہاں ہوتے دور سے پتا لگ جاتا کہ حسن عبداللہ مصروف کار یا پیکار ہیں!

یونیورسٹی میں ''اسٹیوارڈ'' مقرر ہوئے تھے، اس کام کے علاوہ یونیورسٹی میں رسد رسانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اپنے اور دوسروں کے معلوم نہیں کتنے اور مشاغل اپنا رکھے تھے۔ یونیورسٹی میں کوئی تقریب ہونے والی ہو، دوسروں کے یہاں کسی مُہم کا سامنا ہو، شہر میں کوئی جلسہ ہونے والا ہو، علی گڑھ سے باہر کوئی ہمہمہ یا حادثہ ہو، حسن عبداللہ کسی نہ کسی طرح، کسی نہ کسی حیثیت سے پہنچ جاتے اور پیش پیش رہتے۔ گفتگو سے، بحث، مباحثے سے ہاتھ پاؤں سے، شعر و شاعری سے، دل سے، دام سے، دوا دَوِش سے، جسم و جان میں قیامت کی تب و تاب تھی!

لمبے تڑنگے، خوش رو، خوش لباس، اکڑنے اور جھکنے دونوں میں یگانہ، نہ آہستہ بولتے تھے، نہ چپکے سے کام کرتے، ان کی زندگی کے ساز میں دھیما سُر کوئی تھا ہی نہیں، بڑے شریف گھرانے کے تنہا اُجالا تھے، اخلاق و وضع داری میں کھرے مشرقی۔ جس کو محبوب رکھتے اس کو کوئی ناملائم کہے تو حسن عبداللہ کا رنگ متغیر ہو جاتا، پھر نہ وہ اپنا دیکھتے نہ پرایا، نہ چھوٹا نہ بڑا، نہ نیچ نہ اونچ، نہ اپنے بس میں ہوتے نہ دوسروں کے، سنبھل جاتے تو قدموں پر سر رکھ دیتے!

میرے شاگرد تھے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی ہی سے اُردو میں ایم۔اے کیا تھا۔ پی۔ایچ۔ڈی کرنے لندن گئے۔ لڑائی چھڑ گئی تو سلسلہ منقطع کر کے ہندوستان واپس آ گئے۔ گریجویٹ ہوتے ہی وکالت شروع کر دی تھی، لیکن ان کا دل اُردو لکھنے پڑھنے میں لگتا تھا۔ کچھ دنوں آگرہ میں اُردو

فارسی کے لکچرر رہے۔ یہ سب ہوا اور ہوتا رہا، لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو کا معلم بننے کا حوصلہ اور ولولہ دل سے نہ نکلا، کاش کسی نے ان کی وہ والہانہ تمنا دیکھی ہوتی جب وہ اپنے خاص انداز سپردگی میں کہتے تھے، رشید صاحب مجھے کچھ نہ چاہئے مجھے میرے اللہ اور میرے ابا نے کھانے بھر کو دے رکھا ہے!

میں نے ان کو شعبہ میں لینے کی تحریک بھی کی، لیکن ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا۔ یونیورسٹی نے ان کو نہ چھوڑا۔ لڑائی کے زمانے میں رسد رسانی کا جو کام ان کے سپرد کیا گیا تھا وہ اس کو اس انہماک اور سر چکرا دینے والی ایمانداری سے کرتے تھے کہ یونیورسٹی کے حکام کے نظریے کا رد کرنا بھی آسان نہ تھا۔ کہا اُردو لکچرر تو آج نہیں کل کوئی نہ کوئی مل جائے گا، حسن عبداللہ جیسا ایماندار میرِ ساماں نہ ملے گا۔ یہ بات سچی اور پکی تھی۔ ہم میں سے بڑے سے بڑے بے ایمان کا مقولہ تھا کہ حسن عبداللہ جیسا ایماندار کوئی اور نہ تھا!

حسن عبداللہ جذباتی تھے۔ جتنا جلد چڑھ جاتے اتنا ہی جلد من جاتے ہمیشہ چڑھتے پہلے تھے منتے بعد میں تھے، اور جب من جاتے تو پھر آپ کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے۔ مولوی نذیر احمد نے (Explosive) کا ترجمہ بھک سے اُڑ جانے والا مادّہ لکھا ہے اس سے بڑھ کر شاید خود انگریزی کا لفظ بھی مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا۔ حسن عبداللہ کے بارے میں بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھک سے اُڑ جانے والے شخص تھے۔ اس جلالی صفت کے بعد ان کی جمالی صفت آتی۔ جب وہ ہم کو آپ کو منانے کے لیے پاؤں پکڑ لیتے۔ معذرت کے سارے کلمات استعمال کر جاتے اور کام کر دیتے۔

میرے سامنے وہ سگریٹ نہ پیتے۔ دفعتاً ان کے آفس میں پہنچ جاتا اور وہ سگریٹ پیتے ہوتے تو اسے مسل کر چھپا دیتے پھینک دیتے اور سروقد کھڑے ہو جاتے، بارہا کہا کہ اس تکلف میں کچھ دھرا نہ تھا، اس سے آپ ہی سے نہیں، خود اپنے سے بیگانگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہ بات میرے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے، وہ کہتے تھے کہ ان کو یہی اچھا لگتا ہے۔

میں نے ان کو دل جمعیٔ سے آفس میں بیٹھے کبھی نہ پایا۔ کوئی موجود ہے تو اس سے ''بھڑے'' ہوئے ہیں۔ کوئی نہ ہو تو ٹیلی فون ہی پر کسی سے آداب تسلیمات یا پکار اور للکار میں مصروف ہیں۔

ٹیلی فون پر بھی بڑے زور دار دھماکے سے گفتگو کرتے، ایک دفعہ ان کے آفس میں پہنچا اور بولا، حسن صاحب ذرا لائبریری کو ٹیلی فون کرنا ہے۔ کہنے لگے ٹیلی فون خراب ہے۔ میں نے کہا جبھی تو آپ کے ہاں آیا ہوں۔ اٹنشن ہو گئے۔ اور یہ اس بات کا اعلان تھا کہ وہ نہ صرف ہر نامعلوم حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے بلکہ کہیں اور سے حملہ نہ ہوا تو خود حملہ کر بیٹھیں گے۔ بولے، یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی آواز بگڑے ہوئے ٹیلی فون پر بھی منزل مقصود تک پہنچ جائے گی اس لیے آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں...... فوراً جیسے کمر کھول دی، ہنس پڑے۔ کہنے لگے قبلہ آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ ماشاءاللہ یہ ان کا بڑا منجھا ہوا فقرہ تھا، جو وہ خوشی میں بھی استعمال کرتے اور ناخوشی میں بھی!

اُمورِ شریعہ میں بڑے بے جھجک اور بے لچک تھے۔ انگلستان میں ٹیوب کے اسٹیشن پر اُترے، سامنے زینہ، زینہ کے موڑ پر تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی آنے جانے والوں کا ریلا تھا۔ نماز کا وقت یاد آ گیا۔ وہیں نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے، اِدھر کا مجمع ادھر اور اُدھر کا اُدھر، گڑ بڑ مچ گئی۔ پولیس سارجنٹ بلایا گیا اس نے پہلے تو کچھ غور کیا پھر کچھ کہا، یہ رکوع میں چلے گئے، وہ دو قدم پیچھے کھسک گیا۔ اس کے بعد سجدے میں چلے گئے تو اس نے سیٹی بجائی، یہ اُٹھ کر کھڑے ہوئے تو اُس نے ان کے دونوں شانوں کو جھنجوڑا، یہ نیت توڑ کر اس سے گتھ گئے، معاملہ پولیس کمشنر تک پہنچا، اس نے ان کو فہمائش کی کہ شارع عام راستہ چلنے کے لیے ہے، عبادت کے لیے نہیں، اور سارجنٹ کو تاکید کی کہ غیر ملکیوں کا بہرحال احترام کرنا چاہیے۔ یہ واقعہ آج کل کہیں ہندوستان میں ہو جاتا تو اللہ ہی جانتا ہے کیا کچھ نہ ہو جاتا!

شعر کہنے پر بلا کی قدرت تھی، غالبؔ کے دیوانے تھے۔ کیا مجال کوئی غالبؔ کو بُرا بھلا کہہ کر اُن کے سامنے یا ان کی گلی سے نکل جائے۔ تقریر کرنے میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، اس کے پیچھے تو جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ آگرہ کسی کام سے گئے تھے وہیں سے مرض الموت لائے۔ شدّت کا بخار چڑھا، ساتھ دست بھی آنے لگے۔ لوگوں نے ان کے اعزاز میں جلسہ کر دیا تھا، دوستوں نے بہتیرا سمجھایا کہ موقع تقریر کرنے کا نہ تھا۔ آرام کرنے کا تھا، بالآخر طے پایا کہ صرف معذرت کر کے چلے آئیں گے۔ معذرت کرنے کھڑے ہوئے تو 2½ گھنٹے دھواں دھار تقریر کر

ڈالی۔ نڈھال ہو گئے بالآخر علی گڑھ لائے گئے۔ حالت بگڑ چکی تھی لیکن دوڑ دھوپ علاج معالجے سے طبیعت سنبھل گئی، اور لوگوں کو یک گونہ اطمینان ہو چلا تھا کہ مرض پر قابو پالیا گیا ہے۔ لیکن وقت پورا ہو چکا تھا دفعتاً طبیعت نے پلٹا کھایا اور اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے۔

یونیورسٹی میں غلے کی فراہمی اور رسد رسانی کا پہلے پہل انتظام مرحوم کے سپرد ہوا تو کیا دیکھتا ہوں ایک دن اپنے بہترین سوٹ میں ملبوس چلے آ رہے ہیں۔ میں دیکھ کر مسکرایا تو چونکے سے ہو گئے، پوچھنے لگے بات کیا ہے، قبلہ آپ کا مسکرانا خالی از علّت نہیں، میں نے کہا، کوئی بات نہیں، دل خوش ہو گیا، اس زمانے میں کسی کو اچھے لباس میں دیکھ کر یوں بھی دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے لیے کپڑے کا انتظام کر ڈالا تو میرے لیے غلہ کی بھی یقیناً فکر رکھیں گے، تنک گئے بولے، حضور والا یہ سوٹ میں نے انگلستان میں سلوایا تھا، میں اسے عمداً پہن کر آیا ہوں اور اپنے دوسرے کپڑے بھی جلد جلد پہن کر دکھادوں گا تا کہ لوگ کبھی اور دیکھیں تو یہ خیال نہ کریں کہ میں نے یونیورسٹی کا روپیہ کھا کر یہ سب بنوایا ہے، اور قبلہ...... (اب حسن صاحب تیز ہونے لگے تھے) میں نے فلاں صاحب کو اپنا بینک کا حساب بھی دکھا دیا ہے کہ اتنی رقم میری اپنی ہے تا کہ آگے چل کر چہ میگوئیاں نہ شروع ہو جائیں، میں سنجیدہ بن گیا، اور حسن عبداللہ صاحب کو ان کی عاقبت بینی پر مبارک باد دی۔ ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ حسن صاحب اللہ آپ کی مدد فرمائے لیکن آپ کے قیمتی کپڑوں اور بینک میں بچت کی میزان کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کپڑے منگنی کے ہوں۔ رہی بچت سو یہ بھی تو ناممکن نہیں ہے کہ آپ نے کسی سے قرض لے کر دکھا دیا ہو۔ حسن صاحب برس پڑے،، کہنے لگے قبلہ اللہ کے واسطے مجھ پر رحم کیجیے۔ کچھ اور کہنے والے تھے کہ میں ہنس پڑا اور وہ سمجھ گئے اور خود بھی ہنسنے لگے، بولے، قبلہ آپ کی ان ہی باتوں سے تو میں آپ کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا، ماشاء اللہ، جزاک اللہ۔ میں نے کہا اچھا کرتے ہیں کہ سگریٹ نہیں پیتے، لیکن احتیاطاً عقیدت میں کبھی کبھی عقل کا کھوٹ بھی ملاتے رہیے، ورنہ کچھ اور پینے لگیے گا!

پچھلے رمضان میں وائس چانسلر صاحب کے ہاں کچھ لوگ افطار پر مدعو تھے۔ افطار سے پہلے بعض اہم کاموں سے متعلق مشورہ بھی تھا، مرحوم بھی مدعو تھے، لیکن ابھی پہنچے نہ تھے۔ میٹنگ ہو رہی تھی، اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے حسن صاحب کی ایک فروگذاشت یاد

کر کے برہمی کا اظہار کیا اور بار بار کیا۔ بات کوئی ایسی نہ تھی، لیکن جو چیز عجیب سی نظر آئی وہ یہ ڈاکٹر صاحب اس معاملے کو رہ رہ کر یاد کرتے اور برہم ہوتے، حالانکہ حسن عبداللہ کو موصوف بے حد عزیز رکھتے تھے اور مرحوم بھی ڈاکٹر صاحب کے فدائیوں میں تھے، میرا دل بے اختیار چاہا کہ کاش اس وقت حسن عبداللہ آ جاتے عجیب اتفاق کہ حسن صاحب آ موجود ہوئے، سارا کام چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب نے مواخذہ کرنا شروع کر دیا، پہلے تو حسن صاحب اسے معمولی بات سمجھتے رہے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں سنبھل بیٹھے۔ حاضرین میں قاضی خورشید احمد صاحب ایم۔ایس۔سی علیگ مشہور ریاضی داں بھی تھے جو حال ہی میں یو پی کے محکمۂ تعلیم سے ریٹائر ہو کر علی گڑھ آئے اور ڈاکٹر صاحب کے ہاں مقیم تھے، قاضی صاحب کی زبان میں تھوڑی سی لکنت بھی ہے، جو لوگ قاضی صاحب کی ذہانت و فطانت سے واقف ہیں وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے مواقع پر قاضی صاحب کی موجودگی کیا رنگ لا سکتی تھی۔ مرحوم نے جواب دہی شروع کی، ہر شخص خاموش تھا، صرف قاضی صاحب کبھی کبھی سر ہلا دیا کرتے تھے۔ مباحثہ میں گرمی آ چلی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی طلبی دفعتاً ٹیلی فون پر ہوئی اب مطلع صاف تھا، حسن عبداللہ نے قاضی صاحب کی طرف رُخ کیا اور گرج کر بولے اور تو اور آپ کو دیکھیے کس مزے سے گردن ہلاتے تھے۔ قاضی صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے کہ لکنت مانع آئی، میں نے کہا حسن صاحب آپ سمجھتے نہیں، قاضی صاحب تو آپ کی حمایت میں گردن ہلاتے تھے۔ قاضی صاحب نے سٹپٹا کر تنکے کا سہارا لیا، اور بولے اور نہیں تو کیا حسن عبداللہ اب جو گرجے ہیں تو زمین سے آسمان تک سوختن کا باب تھا!'' قاضی صاحب کسی محفل اور مجمع میں بند ہونے والے لوگوں میں نہ تھے۔ لیکن اس موقع پر ایسے زچ ہوئے کہ سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ حسن صاحب نے اسی جوش و جلال میں سائیکل اُٹھائی اور چل دیے، ہم سب نے بہتیرا پکارا کہ افطار کرتے جایئے، لیکن کون سنتا ہے!

کئی دن بعد ملاقات ہوئی تو ہنسنے لگے، بولے قبلہ، آپ نے خواہ مخواہ مجھے قاضی صاحب سے بھڑا دیا، آپ کا تو کچھ نہ بگڑا، روزے کی جھلاہٹ کی مجھے قاضی صاحب سے معافی مانگنی پڑی۔

بڑے دوست پرست تھے۔ان کے بہت سے احباب چھوٹی چھوٹی جگہوں پر تھے، لیکن وہ ان کی خاطر اور ان کی حمایت میں بڑے سے بڑے آدمی سے نبرد آزما ہونے کے لیے سر بکف ہو جاتے۔وہ جس کو اچھا یا اپنا محسن سمجھتے تھے اس کے خلاف کبھی کچھ نہ کرتے، بلکہ اکثر بے محل اور بے جا پاسداری پر اُتر آتے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ ادنیٰ کارروائی پر آمادہ کیے جا سکتے تھے، یا ان کی سیرت میں کوئی بنیادی خامی تھی، وہ جذباتی آدمی تھے، جذباتی آدمی بالعموم مخلص ہوتا ہے، اس کے دل میں کھوٹ کپٹ کا بڑی مشکل سے گزر ہوتا ہے۔طبعًا وہ عوام کے آدمی تھے اور چھوٹوں کی حمایت میں بڑے سے بڑے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔مجھے ان کی یہ ادا بہت بھاتی تھی!

میرا وہ بہت خیال کرتے تھے۔ان کو دیکھ کر میرے دل میں شگفتگی اور اعتماد پیدا ہو جاتا تھا۔اور جس شخص کو دیکھ کر میرے دل کی یہ حالت ہوتی ہے اس کے مرنے کا مجھے بڑا غم ہوتا ہے، لیکن اس غم کا مقابلہ اس غم سے کیسے کروں، اور کون کر سکتا ہے جو مرحوم کے بوڑھے باپ، بوڑھی ماں، بھائی پر فدا ہونے والی بہنوں، نیک نفس بیوی اور معصوم بچوں کو ہوگا۔ایسوں کا غم، اور ایسا غم اس رحمتِ بیکراں کی طرف سے مغفرت کی بشارت ہے، جس کے جوار میں مرحوم پہنچ گئے! میں کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہوں۔

("گنج ہائے گرانمایہ" سے لیا گیا)

نالۂ ضمیرِ حافظ

۱۹۶۶ء

قطعۂ تاریخ وفات

مولوی حسن عبداللہ صاحب حسنؔ - انسپکٹر و کنٹرولر آف انسپکٹرس

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

خلف الرشید مکرمی جناب حاجی ابوالحسن صاحب ریٹائرڈ انسپکٹر

مدارس - بنوالمن

غازیپور

"روضۂ یادگارِ حسن"

۱۳۸۶ھ

حیف صد حیف کہ از دستِ قضا + باغِ ہستیِ حسن گشت تباہ
۱۳۸۶
چہ عجب مردِ خوش اوقات گزشت + کز طریقت بہ شریعت آگاہ
عارفِ کامل و مردِ درویش + زاہد و متقی و صدق پناہ
مخلص و اہلِ وفا اہلِ کرم + سوز در قلب و مروت بہ نگاہ
سالِ رحلت ز تمنا بشنو
فیضِ باری بہ حسن عبداللہ

فاللہ خیر حافظا

۱۹۴۶ء

قطعہ تاریخ وفات

مولوی حسن عبداللہ صاحب حسن۔ انسپکٹر و کنٹرولر آف اکاؤنٹس مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

خلف الرشید مخدومی جناب حاجی ابوالحسن صاحب ریٹائرڈ انجینیر ساکن

غازی پور

روضۂ حسن قدسی نژاد
۱۳۶۵

آہ در عینِ جوانی ز حسن دستِ قضا (۱۳۶۵) + برد و در سلکِ فنا گوہرِ ہستی اش سُفت
حشر افتاد ازیں غم بمیانِ احباب + شد جگر آب ز غم ز آتشِ دوری دل تفت
ز تمنائے حسن بہرِ ناکہ فزوں بود بہ قوم + حیف در چاہِ فنا آں گہرِ شاہاں بنہفت
نیستید ماند چو بیخواب ز درد ملت + رفت در خلد و بآسودگی در جنت خفت
جستم سالِ وفاتش ز سروشِ فردوس
رونق افروز بجنت حسن عبداللہ گفت
۱۳۶۵

از نتیجۂ فکر
تمنا۔ مجبوری

۳۰
۶

ڈاکٹر انوار احمد

یادِ حسن

شیشۂ دل کو چُور کر حسرتِ دل بڑھا کے دیکھ
مورِ ضعیفِ جان پر کوہِ الم گرا کے دیکھ

شیشۂ دل میں عکسِ یار خود سے خودی مٹا کے دیکھ
حسرت و آرزو مٹا ہوش و خِرد گنوا کے دیکھ

دانشِ خیر و شر ہو یا، منطقِ جبر و قہر ہو
ایک کو آزما لیا اس کو بھی آزما کے دیکھ

تڑپے ہیں کس طرح ترے، گھائلِ ناوک ستم
شاہدِ بزمِ لامکاں پردۂ رُخ ہٹا کے دیکھ

تُو ہی بقا کی ابتداء تُو ہی فنا کی انتہا
دے کبھی گل کو رنگ و بو اور کبھی مٹا کے دیکھ

خُوگرِ صبر و ضبط ہوں اُف بھی کروں تو ہے گناہ
زیب نہیں مگر تجھے روتوں کو گر رُلا کے دیکھ

فکرِ حیات مستعار اور مجھے غلط غلط
مشقِ ستم کو اے حضور اور بڑھا چڑھا کے دیکھ

اپنا مقام بھول جاؤں اتنا نہیں ہوں تنگ ظرف
شوق سے تلخ و تند و تیز بادۂ غم پلا کے دیکھ

کشتِ اُمید جل گئی لُٹ گیا نخلِ آرزو
صبحِ سُرور کے خدا شامِ ملال آ کے دیکھ

میں ہوں نیاز مندِ شوق تو ہے خدائے بے نیاز
اپنے تباہ حال کو یوں نہ نظر بچا کے دیکھ

میرے حسؔن کو چھین کر میری بہار لوٹ لی
کیسا ہے یہ ترا کرم، دیکھ نظر ملا کے دیکھ

آہ حسن تم اپنے ساتھ لے گئے کیفِ زندگی
رنگِ چمن بگڑ گیا جانِ بہار آ کے دیکھ

زخمِ جگر کا اند مال امرِ محال ہی سہی
وہ ہے خدائے ممکنات دستِ دعا اُٹھا کے دیکھ

(ڈاکٹر انوار مرحوم کے پھوپھی زاد بھائی اور ہم عمر ہونے کے باعث عزیز دوست تھے۔)
ان کے یہ اشعار اماں کے نام لکھے گئے ایک خط میں ملے

حسن عبداللہ مرحوم کی یاد میں

از

مرتضیٰ صدیقی

وہ خاص بندۂ حق عبدِ نیک عبداللہ
فدائے ملت و مذہب کا اپنے پروانہ
خلوصِ اُلفت و رفعت صفائے طینتِ قلب
گُہر تھے اس کی گرہ میں بہت سے یکدانہ
حریمِ قُدس سے جب حاضری کا حکم آیا
حضورِ حق وہ چلا لے کے جاں کا نذرانہ
ذرا سی دیر میں کچھ ایسا انقلاب ہوا
جو آشنا تھے وہ سب ہو چکے تھے بیگانہ
خزاں کا دور ہے بدلا ہُوا ہے رنگِ بہار
جہاں چمن تھا وہاں ہو رہا ہے ویرانہ
غمِ فراق میں جب دل بہت ہوا بیتاب
سنا یہ خضر سے میں نے سخن حکیمانہ
مآلِ ہستیٔ عالم ہی جب فنا ٹھہرے
حکایتِ غمِ دنیا تمام افسانہ

(مرتضیٰ صدیقی انکم ٹیکس کمشنر تھے اور مرحوم کے بہنوئی اور شیدائی تھے)
یہ نظم ان کے مجموعۂ کلام آئینہ حیرت میں شائع ہوئی

رحمت اللعالمین ﷺ

فسادِ عام غالب تھا سمندر اور خشکی پر
کوئی حق کا نہ تھا طالب سمندر اور خشکی پر

ہر اک سُو دَور دَورہ تھا حماقت کا جہالت کا
ہر اک نقشہ مکمل تھا غوایت کا غلالت کا

خدائی میں خدا کا ماننے والا نہ تھا کوئی
حقوق انسان کا پہچاننے والا نہ تھا کوئی

کوئی تہذیب کا معیار باقی تھا نہ دنیا میں
شرابِ معرفت کا کوئی ساقی تھا نہ دنیا میں

کہ ابلیسِ لعیں کا تھا تسلط ابنِ آدم پر
عجب اک تیرگی چھائی ہوئی تھی سارے عالم پر

کوئی عزّت نہ تھی عورت کی دنیا کی نگاہوں میں
انانیت کا غلبہ تھا فقیروں اور شاہوں میں

غلاموں پر بہائم سے بھی بدتر ظلم ڈھاتے تھے
ستم دیکھو کہ خود انسان انسانوں کو کھاتے تھے

غرض میں کیا کہوں دنیا کی کیسی غیر حالت تھی
اسے اک مصلحِ اعظم کی شدّت سے ضرورت تھی

وہ جس کی ذات ہو ساری خدائی کیلئے رحمت
وہ جس کی ذات سے پسماندہ پائیں اوج اور رفعت

وہ جس کی زندگی ہو اک کرشمہ شانِ یزداں کا
وہ جس کی ذات ہو اعلیٰ نمونہ حُسنِ ایماں کا

جو شمعِ راہ ہو بھٹکے ہوئے صحرا نوردوں کا
جو ہو ہمدرد یکساں عورتوں کا اور مردوں کا

بالآخر رحمتِ سبحانِ برحق جوش میں آئی
جہانِ مُردہ کے قالب میں رُوحِ تازہ در آئی

خدا کا آخری پیغام لیکر اک بشر آیا
نہالِ عرش سے پھر ٹوٹ کر پختہ ثمر آیا

وہ جامع تھا کہ اوصافِ مرّوت تھے تمام اس میں
وہ خاتم تھا کمالاتِ نبوّت تھے تمام اس میں

وہ گمراہوں کو سیدھی راہ بتلانے کو آیا تھا
بھنور میں ڈوبنے والوں کو تیرانے کو آیا تھا

وہ دنیا کیلئے پیغامِ اُلفت لے کے آیا تھا
وہ تعلیمِ مساوات و اخوّت لے کے آیا تھا

وہ جس نے سارے عالم میں ضیائے علم پھیلائی
وہ جس نے خلق کی تفسیر دنیا بھر کو سمجھائی

وہ جس نے توڑ ڈالے بُت مُلوکیّت کی لعنت کے
مٹا ڈالے جہاں سے سب طریقے کفر وظلمت کے

لڑائی میں بھی جس نے صلح کی تنویر چمکائی
فسادوں میں بھی جس نے امن کی تصویر دکھلائی

وہ جس کا خُلق یکساں تھا غریبوں سے امیروں سے
جو شاہوں سے زیادہ اُنس رکھتا تھا فقیروں سے

ہدایت دی بشارت دی بصیرت دی بصارت دی
شرافت دی دلالت دی کرامت دی امارت دی

غرض کچھ اس ادا سے کی مریضوں کی مسیحائی
زمیں بدلی زماں بدلا جہاں نے زندگی پائی

سلام اس پر کہ وہ پیغامِ امن و صلح لایا تھا
سلام اس پر کہ وہ اک شانِ رحمت بن کر آیا تھا

سلام اس پر ریاضِ دہر میں کی جس نے گلکاری
سلام اس پر سکھائے جس نے آئینِ جہاں داری

سلام اس پر جو آیا رہبرِ دنیا و دیں بن کر
سلام اس پر جو آیا رحمتہ اللعالمینؐ بن کر

سلام

سلام اس پر جو تھا ہمدرد بیکس اور یتیموں کا
سلام اس پر جو تھا غمخوار بیماروں غریبوں کا

سلام اس پر جو حامی تھا مساوات و اخوّت کا
سلام اس پر سبق جس نے دیا مہر و محبت کا

سلام اس پر خطا کاروں کی جس نے پردہ پوشی کی
سلام اس پر جفا کاروں کو بھی جس نے اماں بخشی

سلام اس پر ہو جس نے عاجزوں کی دستگیری کی
سلام اس پر ہو مایوسوں کو جس نے زندگی بخشی

سلام اس پر تلطف دشمنوں سے جس کا شیوہ تھا
سلام اس پر سزا دینے میں جس کا ہاتھ رُکتا تھا

سلام اس پر فقیری میں بھی جس نے بادشاہی کی
سلام اس پر شہنشاہی میں بھی جس نے فقیری کی

سلام اس پر دلوں میں بھر دیا خوفِ خدا جس نے
سلام اس پر نکالا دل سے خوفِ ماسوا جس نے

سلام اس پر ہمیں جس نے بتائی راہِ آزادی
سلام اس پر غلامی سے ہمیں جس نے رہائی دی

سلام اس پر جو آیا تھا شفیع المذنبینؐ ہو کر
سلام اس پر جو آیا رحمتہ اللعالمینؐ ہو کر

مناجات

خدایا اس شفیع المذنبیں کا واسطہ تجھ کو
خدایا رحمۃ للعالمین کا واسطہ تجھ کو

الٰہی جو نبی گذرے ہیں سب کا واسطہ تجھ کو
الٰہی نیک جو بندے ہیں سب کا واسطہ تجھ کو

الٰہی واسطہ ہے عصمتِ آلِ پیمبر کا
الٰہی واسطہ ہے تجھ کو کل اصحابِ اطہر کا

الٰہی واسطہ ہے تجھ کو تیری شانِ رحمت کا
الٰہی واسطہ ہے غیرتِ ختم رسالتؐ کا

مسلماں کو مسلماں پھر الہٰ العالمین کردے
دلوں کو ان کے پھر تو نور سے ایمان کے بھر دے

جیئں مرضی پہ تیری اور مریں اسلام پر تیرے
حیات و موت ان کی ہو فقط اک نام پر تیرے

انہیں کھویا ہوا پھر دبدبہ انعام کر مولیٰ
نہ جا اِن کے عمل پر ان پہ تو اکرام کر مولیٰ

بہت خوار و زبوں اب انکی حالت ہوتی جاتی ہے
مریضوں کے دلوں سے اُنکی دہشت کھوتی جاتی ہے

یہ مٹ جائیں گے تو توحید مٹ جائے گی دنیا سے
مسلمانوں ہی تک نعرے ہیں یہ اللہ اکبر کے

فنا ان کو نہ کر توفیق دے ان کو ہدایت کر
بُرے ہیں یا بھلے رحمٰن ہے تو ان پہ رحمت کر

منظّم اُن کو پھر کردے کہ اُن کی اِک جماعت ہو
انہیں توفیق دے مضبوط پکڑیں تیری رسّی کو

ہوا و حرص سے دل پاک کردے انکے اے مولیٰ
عناد و بغض و کینہ سے نجات ان کو دے اے آقا

زنا چوری فریب و مکر سے باز آئیں یہ یکسر
یہ پھر انساں بن جائیں صداقت اِن کا ہو زیور

پھرے ہیں تجھ سے پھر اُنکے دلوں کو پھیر دے یارب
عطا کر ان کو پھر اوصاف تُو انسان کے یارب

انہیں پھر دونوں عالم میں سرافرازی عطا فرما
مراتب اِن کو پھر مولیٰ وہ اعزازی عطا فرما

اسیر بندِ غم ہے یہ ترا بندہ حسنؔ مولیٰ
کرم کر اس پہ بھی اِس کو مصیبت سے رہا فرما

اسے علم و عمل دے تندرستی دے صداقت دے
اسے ایمانِ راسخ دے الٰہی اور عزت دے

نعت رسولِ مقبول ﷺ

مجھے گر خواب میں سرکار کا دیدار ہو جائے
مری کھوئی ہوئی تقدیر بھی بیدار ہو جائے

خدا نے یوں قلمدانِ وزارت آپ کو سونپا
کہ رمزِ خلقتِ انسان کا اظہار ہو جائے

طریقت ہی خبر دیتی ہے رازِ حُسنِ مخفی کی
نہ کیوں بیت الصنم پھر مرجعِ زوّار ہو جائے

مجاز اک پردۂ رنگیں ہے تصویرِ حقیقت پر
نقابِ حُسن جیسے زینتِ رُخسار ہو جائے

ابوجہلوں کو وہ شمعِ ہدایت آپ نے بخشی
کہ ظلمت جس کی ضو سے مطلعِ انوار ہو جائے

کمانگیروں نے پایا آپ سے زورِ ید اللّٰہی
کہ سوکھا گھاس کا تنکا زِرہ کے پار ہو جائے

عمل سے یہ اثر پیدا کِیا طرزِ تکلّم میں
کہ منہ سے بات نکلے اور دلوں کے پار ہو جائے

شفاعت ہو تو ممکن ہے دوا بیماریٔ غم کی
وگرنہ کیسے اچّھا آپ کا بیمار ہو جائے

مِس خامِ طبیعت میں دمک کندن کی ہو پیدا
نظر مجھ پر عنایت کی اگر سرکار ہو جائے

مری نظروں کی دریُوزہ گری ہو باغِ رضواں کی
زیارت روضۂ اقدس کی گر اک بار ہو جائے

اسیری چاہتا ہوں حُسن کی سرکار سے ایسی
جدھر دیکھو اُدھر اک نُور کی دیوار ہو جائے

زبانِ حال سے اظہارِ مطلب اس طرح کردوں
کہ خاموشی حلیفِ شوخیٔ گفتار ہو جائے

اُسے منزل کی دُشواری ہراساں کر نہیں سکتی
نبیؐ جس قافلے کا قافلہ سالار ہو جائے

بدل جائے ہماری شامِ غم صُبحِ سعادت سے
ترّحم کی نظر اُمّت پہ گر اک بار ہو جائے

وفورِ یاس میں بھی ہاتھ آجائے اگر دامن
گھرا ہے دل پہ جو بادل وہ گوہر بار ہو جائے

دلوں میں قوتِ ایمان پیدا ہو تو آساں ہے
کہ انگشتِ شہادت تیغِ جوہر دار ہو جائے

ریا و مکر کا اک جال پھیلانے سے بہتر ہے
کہ تسبیحِ مسلماں روکشِ زنّار ہو جائے

نہاں ہے معرفت کا راز فرضِ خودشناسی میں
کہ صرفِ درسِ عرفاں فطرتِ خوددار ہو جائے

سراسر کُفر ہے مایوس ہونا رحمتِ حق سے
حسنؔ جب رحمت اللعالمینؐ غمخوار ہو جائے

غازی پور
27 فروری 1942ء

حسن عبداللہ کا عکس تحریر

بسکہ ہم دیکھتے تھے رنگِ روانِ ہستی
خوابِ غفلت سے حسن جو نکلنے پائے بھی نہ تھے
اسکا ہر ذرہ یہ ہوتا تھا گمانِ ہستی
مٹ گیا صفحۂ ہستی سے نشانِ ہستی

ہم کبھو دیکھتے تھے خوابِ دوامِ ہستی
آنکھ کھولی ہے نظر آیا نظر کا دھوکا
حاصل یہ سمجھا یا تھا حسن کیف تمامِ ہستی
نقشِ بر آب تھا یہ نقشۂ نامِ ہستی

دیکھو گر محو ہوئے ہم خط و خالِ ہستی
ہست کو نیست سمجھنا بھی زِ بس مشکل تھا
وہ جو مدہوش ہوئے چشمِ غزالِ ہستی
نیست خود ہو کے حسن سمجھے مآلِ ہستی

c: 24/1/1927

آپ سے وصل اگر مرضیٔ تقدیر نہیں
صبر کرنے کے سوا کوئی بھی تدبیر نہیں

دن میں گردش ہے لکھی رات میں تارے گننا
بڑھ کے عاشق سے ترے کوئی بھی دلگیر نہیں

تم مجھے بھول گئے یا کہ خفا ہو صاحب
ایک مدّت ہوئی جب سے کوئی تحریر نہیں

ناوک افگن تری بس ایک نگہ کافی ہے
گو بظاہر ترے ترکش میں کوئی تیر نہیں

راز کو عشق نے ہے فاش کیا رو رو کر
پھر یہ کس منہ سے کہوں لائقِ تعذیر نہیں

اک ذرا زلف کی تنشیر ہی کافی ہے اسے
قیدِ عاشق کیلئے حاجتِ زنجیر نہیں

یوں تو کتنوں نے کیا عالمِ فانی مفتوح
دل کی تسخیر سے بڑھ کر کوئی تسخیر نہیں

نالہ و آہ و بکا شیون و فریاد و فغاں
شغل اپنا ہے و لیکن کوئی تاثیر نہیں

شدّتوں سے مجھے مارا تو نتیجہ یہ ہُوا
دامِ گیسو میں اب ان کے کوئی نخچیر نہیں

ایک ہی جنبشِ ابرو سے کٹینگے لاکھوں
کیا پس وپیش ہے گر ہاتھ میں شمشیر نہیں

ہائے جب سے تری یہ صورتِ زیبا دیکھی
جُز ترے شیشۂ دل میں کوئی تصویر نہیں

دے دیا ان کو حسنؔ تو نے بلا سوچے دل
یہ خطا تیری ہے اُن کی کوئی تقصیر نہیں

جھانسی، 10 اپریل 1922

جب کہا کوچے میں اپنے دن بسر ہونے تو دو
بولے اچھا نخلِ الفت پر ثمر ہونے تو دو

پاؤں میں زنجیر سر پر خاک ہوگی دیکھنا
تم جنونِ کاکلِ مشکیں کو سر ہونے تو دو

کوئے جاناں آشیانہ پھر بنے گا ایک دن
طائرِ بندِ قفس کے بال و پر ہونے تو دو

اہلِ دل لاکھوں تڑپتے خوں میں آئینگے نظر
اس بُتِ سفّاک کو یاں جلوہ گر ہونے تو دو

وصل کی شب جب کہا اس نے کہ بس جاتے ہیں ہم
منّتیں کر کے کہا میں نے سحر ہونے تو دو

ناز و غمزہ ہے ابھی بیداد بھی ہو جائے گی
ان کے بچپن کو جوانی کی نذر ہونے تو دو

اے حسنؔ مشقِ فغاں ہو خود ہی آ جائینگے وہ
بیقراری کیا ہے کچھ دل پر اثر ہونے تو دو

جھانسی، 23 نومبر 1923

جو آئے ہو تماشائے گلستاں دیکھتے جاؤ

جواں ساحر نگاہوں سے مری جاں دیکھتے جاؤ
ہزاروں کشتہ و مجروحِ مژگاں دیکھتے جاؤ

ہزاروں داغِ حسرت لے کے اس دنیا سے جاتا ہوں
جو یہ چاہو مری منزل ہو آساں دیکھتے جاؤ

نمک پاشی کی بے حد اشتہا ہے میرے زخموں کو
کہیں خالی نہ کردیں یہ نمکداں دیکھتے جاؤ

یہ مژدہ عاشقوں کو دو ہلالِ عید نکلا ہے
سرِ مقتل چلو شمشیرِ عریاں دیکھتے جاؤ

حسنؔ سا کم بضاعت اور کجا بزمِ سخن لیکن
بہ اصرارِ ضمیرعالم غزل خواں دیکھتے جاؤ

جھانسی، 6فروری 1924

یہی ذرّے اڑا لے جائینگے اک دن بیاباں کو

مبارک خانہ بربادی جنونِ فتنہ ساماں کو
ہمیں کیا ہے کہ ہم تو گھر بنالینگے بیاباں کو

اسیرانِ محبت کو رہائی خوش نہیں آتی
مجھے ذوقِ اسیری پھر لیے جاتا ہے زنداں کو

اسیرانِ محبت کی رہائی بھی قیامت ہے
بڑی حسرت سے تکتے ہیں در و دیوارِ زنداں کو

عجب میں نو گرفتارِ بلا دلدادۂ غم ہوں
کہ میرا زخمِ دل بھی ہنس کے لیتا ہے نمکداں کو

بڑھی جاتی ہیں یا رب لذّتیں شورِ جراحت کی
کہیں پھیکا نہ کردیں زخمِ دل ہنس کر نمکداں کو

دلِ وحشی کی وسعت چارہ گر ہے خود جنوں افزا
بُلا لیتا ہوں گھر بیٹھے ہی زنداں میں بیاباں کو

مجھے اُس دشت میں پہونچا دیا اس وحشتِ دل نے
کہ شرمائے جہاں کا ذرّہ ذرّہ صد گلستاں کو

ازل کے روز اک ہلکی شُعاعِ حُسن دیکھی تھی
تعالیٰ للہ اب تک خیرگی ہے چشمِ حیراں کو

وہ خود مجبوریوں میں ہے حسؔن اس کو نہ سمجھاؤ
عذر طوق و رسن سے کیا اسیرِ زلفِ جاناں کو

کبھی مر مر کے یہ جینا کبھی مرنا یہ جیتے جی
حسؔن کیوں دل دیا تم نے لب و ابروئے جاناں کو

انجمن ترقی اردو۔آگرہ
9 ستمبر 1926

پُھول ہوجائینگے وہ زخم جوخنداں ہونگے

جو اسیرِ خمِ گیسوئے پریشاں ہونگے
صحنِ فردوس انہیں گوشۂ زنداں ہونگے

ہیں وہ پردے میں تو ہے شوقِ تماشہ ہم کو
پردہ اُٹھا تو ہمیں دیدۂ حیراں ہونگے

ہم سے ناکامِ محبت کو کہاں چین نصیب
مر کے بھی گردِ سرِ گورِ غریباں ہونگے

لُٹ کے یوں آئینگے صحرا سے ترے دیوانے
تار دامن میں نہ ہوگا نہ گریباں ہونگے

زلف و دل ایک ہوئے ربط ہے فطری باہم
وہ پریشاں سے ملینگے جو پریشاں ہونگے

گریۂ گرد نشاں ردِ کدورت ہوگا
ورنہ ہم اور ترے جور سے نالاں ہونگے

ہم جو جیتے ہیں تو یہ طنز کہ مرتا بھی نہیں
جان سے ہم جو گزر جائیں پشیماں ہونگے

لذّتِ غم کو چھپانے کیلئے ہے شِکوہ
بھید پا جائینگے تو در پۓ درماں ہونگے

ہوفِ آہِ جگر و آتشِ سوزِ الفت
ہم سے اس دَور میں کم سوختہ ساماں ہونگے

بختِ خُفتہ کو صدا صور کی آئیگی حسؔن
جب خراماں وہ سُوئے گورِ غریباں ہونگے

آل انڈیا مشاعرہ ایم بی ہاؤس الہ باد
19 نومبر 1927

بیمارِ محبت نہیں محتاج دوا کا

کہنا وہ ترے کان میں کچھ زلفِ دوتا کا
یاں دل پہ مرے لوٹنا افعیٔ بلا کا

ایمن ترے ناوک سے نہ دل ہے نہ جگر ہے
اُس تیرِ نظر نے وہیں مارا جسے تاکا

کشتوں کو تمہارے جرسِ دل سے غرض کیا
یہ قافلہ پابند نہیں بانگِ درا کا

جو ایک سہارا تھا رہا وہ بھی نہ صد حیف
رونا پسِ دیوار وہ ہر صبح و مسا کا

جُوں نقشِ قدم بیٹھ گیا دل سرِ منزل
اک بوجھ بلا وجہ رہا راہ نما کا

اب شکوۂ بے مہریٔ افلاک حسنؔ کیوں
خوش ہو کے کبھی شکر بھی کرتا تھا خدا کا

محمد آباد ضلع غازی پور
9فروری1928

برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں

سر میں خودی کی بُو نہ ہو شرط ہے یہ نماز میں
ہونے دو مے ہے گر حرام سنّتِ پاکباز میں

دل ہے طلسمِ پیچ و تاب بھید نہ اس کا کُھل سکا
راز ہیں اس میں تہہ بہ تہہ جیسے ورق پیاز میں

عاشقِ خستۂ و حزیں خوب ہُوا کہ مر گیا
کام یہ اک بڑا ہُوا غم کی شبِ دراز میں

تارِ گلو پہ نغمہ زن خنجرِ ناز ہو اگر
نغمے ہوں موجزن مرے دل کے خموش ساز میں

چہرۂ زرد و اشکِ سرخ نشرۂ طفلِ عشر خواں
کہنہ سوارِ عشق ہے زمرۂ نو نیاز میں

تابِ نظارہ شرط ہے کھیل نہیں مُشاہدہ
جلوۂ حُسنِ لم یزل دیکھ حسؔن مجاز میں

آل انڈیا مشاعرہ ایم پی ہاؤس الٰہ آباد
22 نومبر 1928

مرا مکتوب گویا قاصدا مثلِ زباں ہوگا

سرِ عرشِ بریں جس دم مرے دل کا دھواں ہوگا
برنگِ پنبہ پھر اُڑتا فضا میں آسماں ہوگا

جنہیں غرّہ تھا بالآخر وہ ہمّت ہار کر بیٹھے
سرِ منزل جو پہنچے گا غبارِ کارواں ہوگا

یہی ذوقِ جبیں سائی رہے قائم تو پھر اک دن
نہ یہ میری جبیں ہوگی نہ سنگِ آستاں ہوگا

چُھری گردن پہ جب رکھ دی تو پچھتانا نہیں اچّھا
نیا مجھ پر ستم ہوگا اگر اب مہرباں ہوگا

صدائے آفریں اٹھے گی ہر وار پر قاتل
ترا خنجر دہانِ زخم میں گویا زباں ہوگا

لگی ہے آگ سینے میں کلیجہ منہ کو آتا ہے
کہیں مصروفِ زاری پھر کوئی آتش بجاں ہوگا

ہتھیلی پر لیے سر خانماں برباد بیٹھے ہیں
ترے کوچے میں ظالم بے نشانوں کا نشاں ہوگا

غریقِ بحرِ عصیاں ہوں مگر کیا غم حسنؔ مجھ کو
کہ شافی بالیقیں روزِ جزا فخرِ زماں ہوگا

محمد آباد ضلع غازی پور
26 دسمبر 1928

ندامت پسِ امتحاں ہو رہی ہے

فزوں سوزشِ دل یہاں ہو رہی ہے
قلم بات پر واں زباں ہو رہی ہے

نئی طرزِ آزار اب یہ نکالی
نہیں ہو رہی ہے نہ ہاں ہو رہی ہے

نظر اک ترحم کی بیمارِ غم پر
کہ اب زندگی بھی گراں ہو رہی ہے

شبِ وصل صبحِ قیامت سے مل جا
بیاں ہجر کی داستاں ہو رہی ہے

مجھے خانہ بربادیاں راس آئیں
لحد تک مری بے نشاں ہو رہی ہے

وہ کیا جنسِ الفت خریدینگے اے دل
جنہیں فکرِ سود و زیاں ہو رہی ہے

سنبھل آسماں پھر وہی آہِ سوزاں
مرے دل میں اب میہماں ہو رہی ہے

مری آہِ سوزاں قیامت بداماں
سُوئے عرش پھر پُر فشاں ہو رہی ہے

تری بیوفائی کا چرچا ہے گھر گھر
وہ گویا مری داستاں ہو رہی ہے

حسنؔ کچھ خدا کا بھی ہے خوف لازم
تری عُمر صرفِ بُتاں ہو رہی ہے

محمد آباد ضلع غازی پور
15فروری1929

کیوں یہ رہ رہ کہ نقاب آپ کی اُٹھ جاتی ہے
آج پیدا میری آہوں میں اثر ہوتا ہے

کس کو یارا ہے کہ سُوئے رُخِ انور دیکھے
تیرِ مژگاں کا حریف اپنا جگر ہوتا ہے

وہ امید اور وہ بیم شبِ فرقت بہتر
اک اداسی کا سماں وقتِ سحر ہوتا ہے

گھر کی یاد آئے تو کیا آئے کہ میں دشت نورد
بیٹھ جاتا ہوں جہاں تھک کے وہ گھر ہوتا ہے

پڑھتا جاتا ہوں حسنؔ میں بھی نمازِ الفت
نقشِ پا سمت نما اس کا جدھر ہوتا ہے

سالانہ آل انڈیا مشاعرہ، ایم بی ہاؤس الہ باد
21 نومبر 1929

قفس میں آہ کھینچوں تو دھواں اٹھے نشیمن سے

غرض برقِ تپاں کی رہتی ہے وابستہ خرمن سے
کہیں دھوکا نہ کھا جانا تبسم ہائے دشمن سے

مرے زخموں کی سوزش سے دلِ آہن پگھل جائے
رواں ہوں تار آنسو کے رفوگر چشمِ سوزن سے

نہیں جز ریزۂ الماس مرہم اپنے زخموں کا
جگر کاری سے فرصت ہو تو لپٹیں جا کے دامن سے

متاعِ دل امانت ہے خمِ گیسوئے دلبر میں
بناتے ہیں امیں رہزن ہی کو ہم خوفِ رہزن سے

سرِ فریاد کس کو ہے خوشی منظور ہے تیری
مجھے مطلب فغاں سے ہے نہ نالے سے نہ شیون سے

خدایا پھونک دیتی کاش میرا آشیاں بجلی
یہ کیا خود ہُوں قفس میں اور لگی ہے تو نشیمن سے

اگر چاہوں مثال اپنی حسؔن اس باغِ ہستی میں
تو ملتی ہے گلِ مہجور شاخِ سبز گلشن سے

آل انڈیا مشاعرہ الہ آباد

22 نومبر 1929

اپنا داماں ہم وہ اپنی آستیں دیکھا کیے

یاد میں ان کے سرِ عرشِ بریں دیکھا کیے
تھی نظر اپنی کہیں اور ہم کہیں دیکھا کیے

اک طرف پاسِ ادب اور اک طرف ذوقِ خلش
ہم پسِ دیوار بیٹھے خارِ چیں دیکھا کیے

پاسِ خوداری انہیں ذوقِ جبیں سائی ہمیں
آستاں اپنا وہ ہم اپنی جبیں دیکھا کیے

تیرہ بختی پر اضافہ زلفِ جاناں کا خیال
روزِ روشن میں بھی چترِ عنبریں دیکھا کیے

دونوں کو تھا روزِ محشر راز داری کا خیال
اپنا دامن ہم وہ اپنی آستیں دیکھا کیے

تیری مشقِ ناز اک تفریح تھی ناوک فگن
تیر دل میں، تیر میں دل جاگزیں دیکھا کیے

رازِ سر بستہ دہن ان کا تھا مدّت سے حسنؔ
وقتِ عرضِ حال، زیرِ لب 'نہیں' دیکھا کیے

سالانہ مشاعرہ انجمن معین الادب فیض آباد
20دسمبر 1929

لیجیے میں مر گیا دشوار جو تھا کر گیا
کیا پس و پیش آپ کو اب نعش اٹھوانے میں ہے

بعدِ مُردن گور پر مشقِ خرامِ ناز ہے
ہم سمجھتے تھے کہ کچھ آرام مر جانے میں ہے

لاش میری دیکھ کر تم آبدیدہ ہوگئے
بے زبانی پر یہ جادو میرے افسانے میں ہے

وُسعتِ پیمانۂ دل ساقیا کیا پُوچھنا
تُو ہی کہہ دے کس قدر مے تیرے پیمانے میں ہے

(غزل نامکمل رہی)

الہ باد
4 جنوری 1930ء

ہنوز حسرتِ دیدارِ یار باقی ہے
کہ حیرت دلِ آئینہ دار باقی ہے

نہ ٹوٹ جائے کہیں کشمکش میں تارِ نفس
ہنوز آمدِ فصلِ بہار باقی ہے

دلیلِ قافلۂ دل بہ جادۂ الفت
نشانِ سجدہ سرِ راہگزار باقی ہے

نہیں ہے مانع ذوقِ جنوں یہ عریانی
ابھی تو جامۂ ہستی میں تار باقی ہے

ازل کے روز جو بدمست نے کبھی پی تھی
اسی شراب کا اب تک خُمار باقی ہے

شبِ فراق اذّیت تمام ختم ہوئی
کہ اور کچھ مرے پروردگار باقی ہے

لحد میں سوئے ہیں جاگے تھے عمر بھر کے حسنؔ
مگر یہاں بھی وہی انتظار باقی ہے

کُھلی رہی پسِ مرُدن بھی آنکھ میری حسنؔ
کُھلا کہ مرنے پہ بھی انتظار باقی ہے

فشارِ قبر سے کیا خوف ہو حسنؔ مجھ کو
کہ دل میں الفتِ ہر چار یار باقی ہے

حسب فرمائش محبّی سید احمد ترمذی صاحب جھانسوی، مقام الہ باد،
6فروری1930

کون سی تھی ساقی اوّل شراب
آج تک مخمور ہے ہر شیخ و شاب

خود جو چشمِ تر سے خُوں ہو کے بہا
مجھ کو لے ڈوبا وہی خانہ خراب

تشنۂ دیدار کو اے خضر کیا
موجِ آبِ زندگی ہو یا سراب

بن گئے اندھے بھی اربابِ نظر
خود ترا غمّاز ہے تیرا حجاب

حالِ دل کس سے کہوں اور کیا کہوں
اضطراب و اضطراب و اضطراب

بھر گیا بیمار کا جامِ حیات
تم عیادت کو جو آئے بے نقاب

دردِ دل کیا موت کا پیغام ہے
چارہ گر نے دے دیا آخر جواب

گُلفتِ کم التفاتی تو گئی
ہے پسندیدہ مجھے تیرا عتاب

تیرے صدقے پھر اسی انداز سے
طُور پر اک برق تھی جو بے حجاب

کہتے تھے جس کو وہ دیوانہ حسنؔ
مرنے پر اس کے ہے ویرانہ خراب

بہ اصرار محبانِ خاص بجواب غزل جگر مرادآبادی
بارہ بنکی اودھ، 6 دسمبر 1932

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

آ جائیں پھر وہ جلووں کو عُریاں کیے ہوئے
تاراج ضبط و ہوش کا ساماں کیے ہوئے

آتے ہیں لوگ میری عیادت کے واسطے
خنجر کو آستین میں پنہاں کیے ہوئے

ہیں جلوہ آفریں مری نازک خیالیاں
بیٹھا ہوں میں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

آنکھیں کُھلی ہیں بعدِ فنا بھی یہ سادگی
ہیں اعتبارِ وعدۂ جاناں کیے ہوئے

گلہائے داغِ دل کی بھی اب دیکھئے بہار
آپ آرہے ہیں سیرِ گلستاں کیے ہوئے

پردہ ابھی اٹھا بھی نہ تھا دل پہ گر پڑی
بجلی وداعِ ہوش کا ساماں کیے ہوئے

تیغِ نگاہِ ناز کو عریاں کیے ہوئے
جاتے ہو کس کے قتل کا ساماں کیے ہوئے

چہرہ ہے زرد فرطِ ندامت سے روزِ حشر
حیراں کھڑے ہیں زُلف پریشاں کیے ہوئے

ہوتا نہیں اُسے جو میسر وصالِ شب
پھرتی ہے صبح چاک گریباں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نخلِ تمنا ہو بارور
دل پاسبانِ حسرت و حرماں کیے ہوئے

لائی ہیں بزمِ غیر میں بیتابیاں مجھے
نذرِ نگاہِ تیز دل و جاں کیے ہوئے

اللہ رے برقِ حُسن کی جلوہ فروزیاں
بیٹھا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

ذرّات کائنات کے ہیں پردہ دارِ حُسن
ہیں اک نگاہِ ناز کے حیراں کیے ہوئے

دل کیا تھا آرزؤں کی دنیا تھی مختصر
اس میں ترا خیال چراغاں کیے ہوئے

تاریک وادیوں میں چلا جارہا ہوں میں
شمعِ خیالِ یار فروزاں کیے ہوئے

کیا رنگ دیکھیں لاتی ہے تر دامنی حسنؔ
تر اشکِ خوں سے جاتے ہیں داماں کیے ہوئے

مشاعرہ بمقام غازی پور
4اگست1934

جنوں میں کاش مل جائے گریباں صُبحِ محشر کا

انہیں منظور ہے گر آزمانا اپنے خنجر کا
لگے ہاتھوں اُتار آئیں چلو بارِ گراں سر کا

مداوا سوزشِ غم کا سمجھ میں جب نہ کچھ آیا
مجھے ہونا پڑا مرہونِ منّت دیدۂ تر کا

نہیں زخمِ دل و زخمِ جگر جب در خورِ بخیہ
تو پھر ممنون کیوں چاکِ گریباں ہو رفوگر کا

یہ وحشت ہے بیاباں تنگ آتا ہے نظر مجھ کو
خیال آجاتا ہے ویرانیوں میں جب مرے گھر کا

ہُوا جوشِ جنوں میں جب وبالِ دوش سر اپنا
بیاباں میں خیال آہی گیا بیساختہ گھر کا

نظر آتی ہے جو شے دلفریبی میں وہ یکتا ہے
عجائب خانہ دنیا ہے اک بُت خانہ آزر کا

بشر جو اس میں الجھا وہ رہا قعرِ مذلت میں
جو بچ نکلا وہی معمار ہے اللہ کے گھر کا

بدولت ناوک اندازوں کی مشقِ ناز پیہم کی
مرا دل ایک گلدستہ بنا طاؤس کے پَر کا

محیطِ بحرِ غم دل اس میں اک آتشکدہ روشن
حسؔن باور کرو ہونا سمندر میں سمندر کا

مشاعرہ محمد آباد ضلع غازی پور،
16 اکتوبر 1934

حسبِ حال

نہ اب دل میں اُمنگیں ہیں نہ وہ پہلے سی جولانی
نہ وہ جذبات باقی ہیں نہ وہ مشقِ سخن رانی

وہ دن کیا خوب تھے جب شعر گوئی تھی مذاق اپنا
کُھلا تھا رازِ ہستی اور نہ تھا احساسِ نادانی

سمجھ آئی تو احساسِ حقیقت ہمرکاب آیا
نظر آنے لگے سب خال و خط تصویرِ نادانی

اندھیری پُرخطر راہیں چلا جاتا ہوں میں تنہا
قدم اٹھتے نہیں بڑھتی ہی جاتی ہے گراں جانی

تلمذ بھی نہیں حاصل بنا ہوں خود خضر اپنا
نہ استعدادِ علمی ہے نہ فرصت نے زباندانی

ابھی تو سیکھنا ہے مجھ کو سطحِ آب پر رہنا
کہاں ہیں اور کہاں غواصئ دریائے عمانی

سزاوارِ خصوصیت نہ تھا ذرّہ نوازی ہے
بُلایا ہے جو مجھ کو تم نے از راہِ مہربانی

مجھے اصرارِ بے حد یاں تمہارا کھینچ لایا ہے
کہاں بزمِ سخن ورنہ کہاں خاطر پریشانی

بتاؤں کیا کہ مجھ کو کس قدر فکریں ہوئیں لاحق
اگر آجاؤں کہنے پر تو اک قصّہ ہو طُولانی

بس اتنا مختصر کہتا ہوں تم سے حضرتِ برتر
کہ میں نے کی ہے کوشش فکر میں تاحدِّ امکانی

خطاب بہ حضرت نادر علی برتر، استاد خاص مہاراجہ ہز ایکسلینسی سر کشن پرشاد۔
وزیر اعظم ریاست حیدر آباد دکن، محمد آباد غازی پور
19 اکتوبر 1934

اتفاقاً مل گئے اک روز اک مردِ بزرگ
یوں کہا مجھ سے دعائے خیر فرمانے کے بعد

دیکھ بیٹا کچھ ہُنر پیدا کر از راہِ کمال
گوہرِ نایاب ہو جا آبرو پانے کے بعد

عرض کی میں نے کہ ہے مرغوب تحصیلِ ہُنر
کیا صلہ ملتا ہے کہیے زہرِ غم کھانے کے بعد

ہو اگر مفلس تو اس کے سب ہُنر بیکار ہیں
ہوتی ہے شہرت مگر افسوس مر جانے کے بعد

بے ہُنر ہی کیوں نہ ہو زردار ہونا چاہیے
عیب ڈھک جاتے ہیں دولت مند ہوجانے کے بعد

عقدۂ لاینحلِ دل اک اشارے میں کُھلے
جیسے وا ہو قُفلِ ابجد بات بن جانے کے بعد

بے ہُنر زردار اچھا ہے کہ مفلس با ہُنر
قدر اس کی زندگی میں اس کی مرجانے کے بعد

سُن کے یہ تقریر یوں گویا ہوئے مردِ بزرگ
حیف ناداں غور کر کچھ ہوش میں آنے کے بعد

بے ہُنر زردار ہے ظاہر میں بیشک کامیاب
نام مٹ جاتا ہے لیکن اس کا مر جانے کے بعد

جس کو دیکھو وہ خوشامد میں لگا ہے رات دن
فکر اپنے پیٹ کی ہے اس کو پرچانے کے بعد

خود غرض جھوٹے فریبی لوگ اس کے گرد و پیش
جو نہ پھٹکیں پاس دستر خوان اٹھ جانے کے بعد

یہ ارسطو اور حاتم سے بڑھا دینگے اسے
اس کا جو انجام ہو فرعون بن جانے کے بعد

وقت آتا ہے کہ ہوتی ہے حقیقت آشکار
حیف لیکن پانی اونچا سر سے ہو جانے کے بعد

آج وہ سب کچھ ہے لیکن کون پوچھے گا اسے
چار دن میں یہ چڑھی ندی اتر جانے کے بعد

قدر دانِ با ہُنر خود با ہُنر اہلِ کمال
کچھ خوشامد سے نہیں مجبور ہوجانے کے بعد

وجہہ استغنا ہوا کرتی ہے تحصیلِ کمال
کیا صلہ درکار ہوگا یہ صلہ پانے کے بعد

علم کی دولت لٹاتے جاؤ بڑھتی جائیگی
یہ زر و گوہر کہاں پھر خرچ ہو جانے کے بعد

شکوۂ افلاس کیسا مفلسی کا کیا ملال
علم کی دولت سے مالا مال ہو جانے کے بعد

رات دن مخمور یوں رہتے ہیں اربابِ کمال
جیسے پیتا ہو کوئی پیانہ پیانے کے بعد

کام اچھا ہے مآلِ کار اچھا ہے اگر
نام رہ جاتا ہے اچھا کام کر جانے کے بعد

جوہرِ قابل کو ملتی ہے حیاتِ جاوداں
علم کے چشمے سے چُلّو بھر کے پی جانے کے بعد

کام لے ہمّت سے کچھ بکتا نہیں آبِ حیات
پی سکا تھا کب سکندر سوچ اسے پانے کے بعد

تشنہ لب رہتا بھلا وہ کیوں جو ہوتا دستیاب
ایک جرعہ گنجِ قاروں صرف ہو جانے کے بعد

زندۂ جاوید ہونا ہے تو کر تقلیدِ خضر
خود بھی پی اوروں کو دے آبِ بقا پانے کے بعد

میں حسنؔ کچھ اور کہنا چاہتا تھا دفعتاً
ہوگئے غائب وہ یوں ارشاد فرمانے کے بعد

علم حاصل کر نہ کر گنجینۂ زر کی تلاش
حیف گر اب بھی نہ سمجھا اتنا سمجھانے کے بعد

محمد آباد ضلع غازی پور
19 اکتوبر 1934

مخمس

تضمین بر غزلِ غالب

نالہ کرنا ہے ہمیں خونِ جگر ہونے تک صدفِ چشم میں قطروں کے گہر ہونے تک
غم نہیں ہم نہ رہیں تجھ کو خبر ہونے تک آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

صیقلِ آئینہ لازم ہے کہ تا دُور ہو زنگ منزلیں عشق کی مشکل ہیں مگر خوش آہنگ
ہر قدم پر ہے یہاں نوعِ بشر کیلئے جنگ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہے تقاضائے جنوں آنکھ سے ٹپکے خوں ناب دلِ بیتاب تڑپتا ہے مثالِ سیماب
چشمِ ساقی کا اشارہ کہ چلے دورِ شراب عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

حالِ دل تم پہ کُھلے اس کی ہیں آہیں ضامن	خلوتِ ناز میں کاش ان کا گزر ہو ممکن
ہے یقیں آؤ گے پُرسش کو سنو گے جس دن	میں نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک

شعلہ بن جائے شرر ہے یہ ہوا کی تعلیم	قطرہ دریا بنے تکمیلِ عطا کی تعلیم
ذرّہ صحرا میں ہو گم، ہے یہ بقا کی تعلیم	پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

ہے میّسر تجھے گر لُطفِ شراب و محفل	تجھ کو لازم ہے کہ لے ہاتھ میں محتاج کا دل
دردمندوں کو ستانے سے نہیں کچھ حاصل	اک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمئی بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

کیوں حسنؔ خیر تو ہے کس لئے برہم ہے مزاج	تابِ غم لا نہیں سکتے تو مرو ڈوب کے آج
ورنہ مر مر کے جیو اس میں ہے جانباز کی لاج	غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

پہتیا ضلع غازی پور
7,6 جنوری 1935

قصیدہ

تہنیت تشریف آوری نواب ہز ہائینس کیپٹن سر سیّد رضا علی خان بہادر
سلطنت فرمانروائے ریاست رامپور

یونین کے گلستاں میں آج آئی ہے بہار
گُل تو گُل پتّوں پہ ہے مشاطۂ فطرت نثار

بزمِ عیش و کامرانی میں یہ قندیلوں کا نُور
ذکر کیا خورشیدِ عالمتاب ہو ان سے دوچار

بزمِ انجم ہوگئی بے نُور ان کے سامنے
حُسنِ اصلی کے مقابل کب ہو حُسنِ مستعار

محوِ نظارہ ہیں چُھپ چُھپ کر بنات النعش بھی
ماہِ دو ہفتہ نظر آتا ہے دیکھو داغدار

بعد مدّت پھر زمیں پر ہے کچھ ایسا انبساط
جس سے بے رونق ہوئی ہے بزم چرخِ نابکار

دن پھرے اس یونین کے از سرِ نو
پھر ہوا بدلی چمن کی آ گئی فصلِ بہار

ہوگئے شاداب غنچے گل ہنسے بُوٹے کھلے
جس کو دیکھو اس کی صورت سے خوشی ہے آشکار

پُھول ہیں یاقوت اور پتّے زمرّد کی ہیں قاش
جوہری کی ہیں دکانیں تختہ ہائے لالہ زار

قمریاں کرتی ہیں گو گو بُلبلیں ہیں نغمہ سنج
چہچہے کرتے ہیں ہر سُو طائرانِ شاخسار

آج وہ دن ہے جسے دیکھو وہی مدہوش ہے
بادۂ سر جوشِ عشرت کا ہُوا ارزاں خُمار

ہر طرف چلتی ہے گلشن میں نسیمِ جانفزا
مُشک بیز و مُشک ریز و مُشک بُو و مُشکبار

آرہا ہے شاہدِ گلزار وہ سُوئے چمن
جس کی آمد ہے نویدِ مژدۂ فصلِ بہار

وہ نواب ابنِ نواب ابنِ نواب ابنِ نواب
جس کے اسلاف بزرگ و محترم سب با وقار

دستگیرِ قوم و ملّت والیانِ رامپور
جن کے احساں اس ادارے پر ہیں بے حد و شمار

خسروِ عالی نسب جنّت مکاں حامد علی
جن کے اوصافِ حمیدہ کا نہیں ممکن حصار

ان کی اک ادنیٰ صفت فیاضی و دریا دلی
جس کے باعث یونین کا آج قائم ہے وقار

تا قیامِ قوم قائم ہے یہ قومی درسگاہ
محسنانِ قوم کی فیاضیوں کی یادگار

آج آیا ہے یہاں فرمانروائے رامپور
فخرِ قوم و ملّتِ بیضا کا سچّا جاں نثار

قوم کا سر تاج ۔ عالی گوہر و والا حشم
ہے جلو میں جس کے شاہی تمکنت عزّ و وقار

سچ کہا ہے "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد"
ان کی ہستی قوم کو ہے مایۂ صد افتخار

ان کے قدموں ہی کی برکت سے ہماری یونین
ہے یقیں اپنے مقاصد میں رہے گی کامگار

ان کی توصیف و ثنا خوانی میں شاعر تر زباں
شاکیٔ کوتاہ دستی فطرتِ عنقا شکار

مختصر یہ ہے دُعا پر ختم کرتا ہوں کلام
اعترافِ عاجزی میں پیشکش ہے اقتدار

ہے دُعا اپنی حسؔن صدق و خلوصِ دل کے ساتھ
اس چمن کو رکھ الٰہی تو ہمیشہ برقرار

لہلہاتا اور پھلتا پُھولتا دائم رہے
اور کبھی لگنے نہ پائے چشمِ زخمِ روزگار

دوست شاداں کامگار و شاد کام و بامراد
ناتواں ہیں تا ابد بادیدۂ نم سوگوار

محسنِ اعظم ہے یہ یا رب سدا قائم رہے
یونین پر اِس کا اُس پر سایۂ پروردگار

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
22 جنوری 1935

خمِ گیسو کی خُوبی ہے کبھی میرے مقدّر کی

حدیثِ عشق تیرے دل جلوں نے جب کبھی سر کی
تو پیدا ہوگئی ذرّات میں تاثیر اخگر کی

اڑا بھی دو وبالِ دوش مجھ کو بھی ہے برسوں سے
قسم کھاتے ہو کیوں ہر بات پر ناحق مرے سر کی

ابھی مٹ جائینگے سب تفرقے شیخ و برہمن کے
نقاب اس شوخ کے رُوئے منوّر سے اگر سرکی

سب اپنا حال ان سے قیس کے پردے میں کہہ ڈالا
مہم دشوار بے شک تھی جو ہم نے آج یوں سر کی

بلا سے جان جائے آزمائش آج ہونی ہے
ہماری سخت جانی کی اور اس کافر کے خنجر کی

مری بیتابیٔ دل کا یہ اک ادنیٰ کرشمہ ہے
نصیبِ آسماں ہیں گردشیں میرے مقدّر کی

مجھے ہے پاسِ ضبطِ غم وگرنہ اپنی آہوں سے
ابھی دم میں اڑادوں دھجیاں چرخِ ستمگر کی

کوئی دم توڑتا ہے چارہ گر خاموش بیٹھے ہیں
نہ آؤ تاب لاسکتے نہیں تم ایسے منظر کی

طبیبو ہوش میں آؤ مریضِ غم کو مرنے دو
یہی تدبیر ممکن ہے سکونِ قلبِ مضطر کی

مشامِ جاں میں اب تک تازگی محسوس ہوتی ہے
ازل کے دن اڑی تھی کچھ مہک عرفاں کے ساغر کی

یہ سوزِ غم حسنؔ کم ہو تو ٹانکے زخم پر ٹھہریں
اِدھر جاں کشمکش میں ہے اُدھر ہے ضد رفوگر کی

تری شانِ کرم نے بات رکھ لی دامنِ تر کی
حرارت سرد ہو کر رہ گئی خورشیدِ محشر کی

لگائے اس نے جو ٹانکے وہ دم بھر بھی نہیں ٹھہرے
ہے سوزِ غم کے ہاتھوں دیدنی حسرت رفوگر کی

حسنؔ مر کر دکھا دیتا مگر یہ خوف ہے مجھ کو
زمانے بھر میں رُسوائی نہ ہو بیداد دلبر کی

محمد آباد ضلع غازی پور
30 جنوری 1935

کہاں سے لائے گا قاصد دہن میرا زباں میری

خدا را سیکھ لے اے نامہ بر طرزِ بیاں میری
مبادا پوچھ بیٹھیں تجھ سے وہ بے تابیاں میری

کُھلے گی کس طرح تم پر وفا میری جفا اپنی
تمہیں نیند آئے گی جب داستاں ہوگی بیاں میری

گزرتے ہی خودی سے میری خود بینی بڑھی اتنی
نظر آتی ہے جو شے اس میں صورت ہے عیاں میری

پتہ نقشِ قدم سے میرے پائینگے وہ منزل کا
بنائینگے جو خضرِ راہ گردِ کارواں میری

تمہیں آزار ہوگا قصۂ غم ورنہ کہہ دیتا
نہ بے قابو ہے دل میرا نہ قاصر ہے زباں میری

نہاں ہے میری خاموشی میں رازِ عافیت ہمدم
قیامت اک بپا ہوگی کُھلے گی جب زباں میری

وہی روزِ ازل میں تھا کہ مسجودِ ملائک تھا
مرا سر غیر کی ٹھوکر پہ بداعمالیاں میری

کبھی کتمِ عدم میں روز و شب تھی یار سے وصلت
کہاں سے بدنصیبی مجھ کو لائی ہے کہاں میری

مجھے دم توڑنے دو میرے بالیں سے چلے جاؤ
پریشانی تمہاری کہہ نہ دے سب داستاں میری

خدا نے رحمت اللعالمینؐ خود جس کو فرمایا
خطائیں بخشوائیں گے شفیعِ عاصیاں میری

چُھری مقتل میں چلتی تھی حسنؔ جب میری گردن پر
کھڑی بالیں پہ ہنستی تھی حیاتِ جاوداں میری

مشاعرہ بمقام غازی پور
25جون1935

شوقِ منزل نے رکھا آوارۂ منزل مجھے

سعئ لا حاصل سے اتنا تو ہُوا حاصل مجھے
یاد آتی ہی نہیں اب آرزوئے دل مجھے

کشتئ دل مختصر غم بحرِ ناپیدا کنار
اس تلاطم میں نظر آتا نہیں ساحل مجھے

شوقِ منزل ہے تو منزل بھی ہے زیرِ پائے شوق
کیوں نہ ہو ہمّت مری خضرِ رہِ منزل مجھے

ہے سکونِ دل مرا دن موت کا اے چارہ گر
زندہ رکھتا ہے مرا یہ اضطرابِ دل مجھے

ناخدا کشتی خدا پر چھوڑ دے لے جائینگی
خود ہی ہاتھوں ہاتھ موجیں جانبِ ساحل مجھے

سوچنے سے فائدہ کیا بندہ پرور بعدِ ذبح
دیکھو دامن کی خبر لو ۔ چھوڑ دو بسمل مجھے

کس خطا پر میں ہُوا مستوجبِ چندیں عذاب
تشنہ لب تنہا رکھا کیوں ساقیٔ محفل مجھے

موج آسا اضطرابِ دل ہے وجہ زندگی
ہے میسّر ورنہ ہم آغوشیٔ ساحل مجھے

کھو گیا ہوں اس طرح میں راہِ الفت میں حسنؔ
ڈھونڈتا پھرتا ہوں دل کو ڈھونڈتا ہے دل مجھے

مجی مرتضٰی صدیقی کی فرمائش پر
غازی پور یکم اکتوبر 1935

ہر مرقع میں نظر آتی ہے صورت یار کی

چارہ گر کیوں چپ ہیں کیا حالت ہوئی بیمار کی
کیوں ہے یہ بدلی ہوئی صورت در و دیوار کی

اے دلِ ناآشنائے جذبِ الفت ہوشیار
دیکھ ہر شئے میں نظر آتی ہے صورت یار کی

تو بجا کہتا ہے لیکن یہ تری سنتے ہیں کب
تو نے دیوانوں سے ناصح کس لئے تکرار کی

ناصحا سمجھانے بیٹھا ایک دیوانے کو تُو
قابلِ افسوس ہے دیوانگی ہشیار کی

قطرہ دریا میں ملا تو خود بھی دریا ہوگیا
کیا حقیقت ورنہ اک ناچیزِ بے مقدار کی

'ہاں، نہیں' کچھ منہ سے کہہ دیجیے کہ یکسوئی تو ہو
بندہ پرور یہ نئی ترکیب ہے آزار کی

کس لئے ناحق یہ حجّت' اس سے پردہ کیا ضرور
تاب لاسکتا نہیں جو آپ کے دیدار کی

ناکسوں کو بزمِ مے میں یہ پیالے بہ جامِ مے
تشنہ اٹھ جائیں یہ قسمت ساقیا میخوار کی

جس نے پایا ہے حسنؔ شوریدہ سر بیتاب دل
اس کو سمجھانے کی زحمت آپ نے بیکار کی

2

بات بھی اچھی نہیں لگتی در و دیوار کی
بھاگئی ہے اب طبیعت کو ہوا کوہسار کی

تجھ کو جو کہنا ہے کہہ لے اور اپنی راہ لے
ناصحا دیوانوں سے ٹھانی ہے کیوں تکرار کی

تا کجا خواری و ذلّت تا کجا رنج و عذاب
چھد گیا دل ہنستے ہنستے چشمکیں اغیار کی

جان سے تنگ آچکا تھا خودکشی سے عار تھی
شرم رکھ لی موت نے آ کر ترے بیمار کی

میں نہ کہتا تھا دلِ دیوانہ سننے کا نہیں
اے حسنؔ چھوڑو چلو کوشش ہے یہ بیکار کی

محمد آباد ضلع غازی پور
8فروری1936

کس قدر خواری ہوئی افسوس میری ہائے ہائے
جوڑنا ہاتھوں کا اس پر جُبہ سائی ہائے ہائے

ہو گیا اکرام اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا
میں سمجھتا تھا یقینی کامیابی ہائے ہائے

خرچ اتنا ہوگیا اور ووٹ اتنے کم ملے
ہوگیا ہوں مبتلائے اُدھ کپاری ہائے ہائے

غیر ہوں تو ہوں ۔ غضب ہے طعنہ زن احباب ہیں
کی گوارا جن کے بل پر میں نے خواری ہائے ہائے

دعوتیں کھائیں فریب ووٹ دے دیکر مجھے
کیا ہوئی وعدوں کی سب وہ استواری ہائے ہائے

مجھ سے وعدہ کرکے مرغا کھا لیا پھر دی دغا
حیف یہ گندم نمائی جَو فروشی ہائے ہائے

بانس پر تو میں چڑھا اور آپ کا ٹھہرا مذاق
اٹھ گئی دنیا سے شاید رسمِ یاری ہائے ہائے

پھر یہ کہتے ہیں الیکشن میں نہیں وعدوں کا ٹھیک
تو نے کیوں باور کیا؟ یہ سادہ لوحی ہائے ہائے

طعنۂ احباب بدتر چشمکِ اغیار سے
حیف دونا ہوگیا احساسِ خواری ہائے ہائے

مجھ سے آنکھیں پھیرلیں میری تسلّی کے عوض
کیا یہی تھا مقتضائے رسمِ یاری ہائے ہائے

یہ روّیہ دوستوں کا کیوں نہ عبرت خیز ہو
کھل گئی عالم کی مجھ پر بے ثباتی ہائے ہائے

میں نے جھنجلا کر کہا اچّھا ہُوا جو ہوگیا
زیر باری اس قدر تقدیر میں تھی ہائے ہائے

ہنس کے میرے عہد پر دیتے ہیں زچہ کی مثال
بھول جائیگی کوئی دن میں یہ خواری ہائے ہائے

کامیابی دوسروں کی گر الیکشن جیتیے
ہاریے تو ہارنے والے کی ہاری ہائے ہائے
سنتے تھے دیکھی نہ تھی خواری الیکشن کی ضیاؔء
اب نہ ہوگی عُمر بھر امیدواری ہائے ہائے

نوحہ منجاب مسٹر ضیاء الدین احمد
برنا کامیابی خود در الیکشن وائس پریذیڈنٹ مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ 37-1936
علی گڑھ 29 نومبر 1936

آج کُچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

حالِ دل کہیے تو بے مہر خفا ہوتا ہے
شکوۂ جور تقاضائے جفا ہوتا ہے

بُلبلہ بحر میں جس وقت فنا ہوتا ہے
کچھ خبر ہے اسے کیا رُتبہ عطا ہوتا ہے

آہِ خاموش کی کس کو ہو خبر کون سُنے
کیجیے نالہ تو اک حشر بپا ہوتا ہے

اک بڑا فرض رہِ عشق میں ہے پاسِ ادب
سر کے بل طے ہو یہ منزل تو ادا ہوتا ہے

اک اشارے میں بدل دیتا ہے وہ تقدیریں
جو گدا در پہ ترے ناصیہ سا ہوتا ہے

ناصحا چھوڑ بھی دے مجھ کو مری حالت پر
کوئی غمخوار کہیں رنج فزا ہوتا ہے

ہم دُعا کرتے رہیں گے وہ سُنے یا نہ سُنے
بندہ ہر حال میں راضی بہ رضا ہوتا ہے

تم یہی سمجھو کہ ہوتا ہے ہدف دل ہر بار
میں نہ لوں دل پہ تو ہر تیر خطا ہوتا ہے

زیست دشوار تھی مرنا بھی نہ مشکل ہوجائے
نزع میں آتے ہیں وہ دیکھئے کیا ہوتا ہے

میری کوشش میں ہے مضمر مری تسکین کا راز
ورنہ انسان کی تدبیر سے کیا ہوتا ہے

مجھ کو ڈر ہے کہ نہ آنکھوں سے کہیں پھوٹ بہے
چھیڑ مت، دیکھ دلِ زار بھرا ہوتا ہے

بھر چکا رہنے بھی دو چارہ گرو باز آؤ
پھر بہار آتی ہے پھر زخم ہرا ہوتا ہے

خط سے مطلب نہ کھلے عرضِ تمنّا مشکل
ضبطِ غم اور بھی اندوہ فزا ہوتا ہے

پھر بڑھی وحشتِ دل مست ہواؤں سے حسؔن
ایسے آغاز کا انجام بُرا ہوتا ہے

2

مرنے سے پہلے جو مرتا ہے خدا کا بندہ
اس میں کیا شک ہے کہ واصل بہ خدا ہوتا ہے

کیوں نہ مخدومِ خلائق ہو کرم سے تیرے
جو گدا در پہ ترے ناصیہ سا ہوتا ہے

اپنی کوشش میں ہے ناکام کی تسکین کا راز
ورنہ ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

سخت مشکل ہے ذرا آنکھ اٹھی آگ لگی
مبتلا حیف سمک تا بہ سما ہوتا ہے

سر کے بل راہِ صحابہ پہ چلو بے کھٹکے
نقشِ پا ان کا حسؔن قبلہ نما ہوتا ہے

21 نومبر 1936 کو غازی پور سے علی گڑھ واپس جاتے ہوئے یہ غزل ٹرین میں لکھی گئی
فرمائش محبی محمد طاہر فاروقی عرف نوشہ میاں
نواں سالانہ آل انڈیا مشاعرہ آگرہ کالج
19 دسمبر 1936 کو یہ مشاعرہ آگرہ میں ہوا

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے

وہ سر گرمِ جفا جب اے دلِ ناشاد ہوتا ہے
معاذ اللہ زمانہ مائلِ بیداد ہوتا ہے

یہ کیا کم ہے وفاؤں کا مری ان کو یقیں آیا
نیا کیوں ورنہ ہر لحظہ ستم ایجاد ہوتا ہے

اثر تقریر میں چاہے تو کر جوشِ عمل پیدا
ہوا پر قصرِ عالیشان بے بنیاد ہوتا ہے

لبِ خاموش نے آہوں کا کچھ ایسا سماں باندھا
دھواں بن کر غبارِ آسماں برباد ہوتا ہے

اُنہیں سُود و زیاں کا درس دینا ہے عبث واعظ
کہ دیوانوں کا مسلک ہر چہ بادا باد ہوتا ہے

زمانہ کروٹیں بدلے گا پھر میرے اشاروں پر
وہی بُھولا ہُوا مجھ کو سبق پھر یاد ہوتا ہے

تعال اللہ قفس میں یہ عنادل کی غزلخوانی
بہر حال ان کو پاسِ خاطرِ صیّاد ہوتا ہے

علاجِ وحشتِ دل چارہ گر اس سے نہیں ہوتا
کہ زنداں میں جنوں کچھ اور بھی آزاد ہوتا ہے

مزّین بیڑیوں سے ہو کے جب چلتا ہے دیوانہ
تو کوسوں دُور تک شورِ مبارکباد ہوتا ہے

حسنؔ اصلا نہ گزرے چارہ جوئی کا گماں مجھ پر
دہانِ زخم ہم شکلِ لبِ فریاد ہوتا ہے

آل انڈیا مشاعرہ زیرِ اہتمام
انجمنِ اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
13 فروری 1937

ٹھانی تو ہے کہ عرضِ تمنّا نہ کیجیے

یا میرے شوقِ دید کو رُسوا نہ کیجیے
یا بے محابا آیئے پردہ نہ کیجیے

بیمار آپ کا ہوں میں عیسیٰ نفس ہیں آپ
منظور گر نہیں ہے، تو اچھا نہ کیجیے

کم ظرف سے نہ رکھیئے زیادہ توقعات
یا شکوۂ شکایتِ بے جا نہ کیجیے

ہم کو ہے اپنے جذبِ دلِ ناتواں پہ ناز
ان کو یہ ضد کہ وعدہ کی ایفا نہ کیجیے

جلیئے بسانِ شمع کہ محفل بھی گرم ہو
کیوں پیرویٔ سوزشِ پروانہ کیجیے

کہ اعتبارِ توبۂ زندانِ پارسا
اک جا بہم نہ شیشۂ پیمانہ کیجیے

جو میرے ساتھ ہو وہی غیروں کے ساتھ ہو
یوں ہے تو میرا عقدۂ دل وا نہ کیجیے

ہوں فیض یاب مبدٔ فیاض سے حسنؔ
کیوں فنِ شعر گوئی میں دعویٰ نہ کیجیے

آل انڈیا مشاعرہ اسکالرز یونین، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
22دسمبر 1937

کہاں ہے کہاں ہے کہاں ہے کہاں ہے

غمِ دین و دنیا سے دل کو اماں ہے
غمِ عشق میں راحتِ جاوداں ہے

اُسی کے ستم کی شکایت اُسی سے
وہی مہرباں ہے جو نامہرباں ہے

عدو نے کیا اس کو خوگر ہوس کا
محبت پر اس کو ہوس کا گماں ہے

میں اندازِ کم التفاتی سے سمجھا
کہ ناگفتہ سب حال تجھ پر عیاں ہے

وہ سو طرح جلوے دکھاتے ہیں لیکن
میں دیکھوں تو کیونکر نظر درمیاں ہے

سنبھل جائے کہہ دو سمک سے سما تک
سنبھلنا ہو جس کو کہ قصدِ فغاں ہے

دو عالم ہوں زیر و زبر اک تڑپ میں
یہ تاب و توانِ دلِ ناتواں ہے

معاذ اللہ یہ بادِ صر صر کے جھونکے
قصور اسقدر باغ میں آشیاں ہے

نہ بُھولا نہ بُھولے گا دل عہد و پیماں
یہ روزِ ازل بھی یہیں تھا جہاں ہے

نہ جنّت کی خواہش نہ دوزخ کا کھٹکا
جنوں میں کسے فکرِ سُود و زیاں ہے

وہ آتے ہیں بہرِ عیادت سنبھل جا
مرے قلبِ مضطر ترا امتحاں ہے

نشاں دے رہا ہے مگر قلبِ مضطر
یہاں ڈھونڈیئے اس کی منزل یہاں ہے

حسنؔ حُسنِ مطلق کا دعویٰ مسلّم
وہ آزاد قیدِ زمان و مکاں ہے

حسبِ فرمائش محبی محمد طاہر فاروقی عرف نوشہ میاں
آگرہ 23 مئی 1938

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے

آزمائش ضبطِ غم کی آپ کو منظور ہے
لیجیے وقفِ جفا میرا دلِ رنجور ہے

لُوٹ لے میری متاعِ ہوش دل کو پھونک دے
شعلۂ برقِ تجلی تُو کہاں مستور ہے

مجھ سے درماندہ کی ہمّت یہ کہ بڑھتے جایئے
خضرِ رہ کا ہنس کے فرمانا کہ منزل دور ہے

عشق بے توقیر ہی ہے باعثِ اعلانِ حُسن
تیری شہرت کُوبکُو تُو آج تک مستور ہے

مُردہ روحیں جاگ اٹھیں اس کی اک آواز پر
نعرۂ مستانۂ وحشی صدائے صُور ہے

مجھ سے سُنئے میں بتاؤں رمزِ جبر و اختیار
مجھ کو بھی منظور ہے جو آپ کو منظور ہے

دیکھنے والے ہراساں جلنے والے مطمئن
آتشِ جاں سوزِ الفت کا عجب دستور ہے

صیقلِ آئینۂ دل جُبہ سائی سے ہوئی
داغِ پیشانی نشانِ سینۂ پُر نُور ہے

حضرتِ زاہد جہاں بیٹھے ہیں ہمت ہار کر
منزلِ مقصودِ ہستی واں سے کوسوں دُور ہے

جب سے پایا ہے دلِ وحشی نے رازِ حُسنِ یار
ذرّہ ذرّہ گلستانِ عشق کا منصور ہے

ایک جُوئے شِیر کی خاطر یہ محنتِ کوہکن
حاصلِ غم جُوئے خوں بے منّتِ مزدور ہے

میرے سجدوں کو غرض پر مشتمل کیوں کیجیے
معترف ہوں میں تمناؤں میں دلِ محصور ہے

عبدیت کی شانِ استغنا نہیں ہر گز نہیں
عرضِ حالِ دل پہ یہ ناچیز کیوں مقہور ہے

اس کے جلوے دل میں ہیں جو آنکھ سے معذور ہے
داغِ ظرفِ عاشقِ شیدا چراغِ طُور ہے

مجھ سے درماندہ کی ہمّت یہ کہ بڑھتے جایئے
خضرِ رہ کا ہنس کے فرمانا کہ منزل دُور ہے

محتسب سارے جہاں کا درد رکھتا ہے اُسے
احتسابِ نفس کی فرصت کہاں معذور ہے

اللہ اللہ چشمِ آہو کی یہ مستی حسنؔ
جس نے دیکھا ہے اسے وہ بے پیئے مخمور ہے

یہ غزل آگرہ سے حیدرآباد جاتے ہوئے ٹرین میں 31 مئی اور یکم جون 1938 کے درمیان لکھی گئی
بہ تعمیلِ حکم محبی محمد طاہر فاروقی عرف نوشہ میاں پروفیسر فارسی آگرہ کالج
یکم جون 1938

محبت

محبت واقعی کیا ہے بہت مشکل ہے بتلانا
وہی سمجھے خمارِ مے کو جس پر کیف طاری ہے

محبت دل میں ہوتی ہے کوئی دکھلائے دل کیسے
زباں رکھتی ہے گویائی مگر الفت سے عاری ہے

تموّج بحر میں پنہاں ہو جیسے یا گلوں میں بُو
محبت ایک کیفیت ہے جو رگ رگ میں ساری ہے

محبت ہی سے ربطِ باہمی ہے بلبل و گُل میں
اسی سے ملکِ دل پر زلف کی سر رشتہ داری ہے

انالحق اور انا لیلےٰ ہیں اک تصویر کے دو رخ
کہ پہلا وار الفت کا خود کو ضربِ کاری ہے

محبت ہی سے ہوتی ہے گوارا تلخئ دوراں
کہ پہلے ہی قدم پر اس میں رُسوائی ہے خواری ہے

جو اس میدانِ وحشت زار میں سرگرمِ تگاپو ہیں
انہیں منزل کی دشواری نویدِ کامگاری ہے

یہی تریاق بھی ہے اور یہی زہرِ ہلاہل بھی
اسی پر کوئی جیتا ہے کوئی جینے سے عاری ہے

کبھی مر مر کے یہ جینا کبھی مرنا یہ جیتے جی
جنوں آئینِ اُلفت میں دلیلِ ہوشیاری ہے

وہ شے مُردہ ہے جس نے ایک حالت پر سکوں پایا
کہ بے شک زندگی کا راز دل کی بیقراری ہے

محبت سے تمنّائیں دلوں میں ہوتی ہیں پیدا
تمنّاؤں کا حاصل یاس و حرماں اشکباری ہے

تمنّا کوئی بر آئے نہ آئے چین کب آئے
محبت ہے تو فریاد و فغاں ہے آہ و زاری ہے

یہ کشتِ دل سدا سر سبز رہتی ہے محبت میں
کہ صبح و شام اسکی آنسوؤں سے آبیاری ہے

محبت رنگ بھر دیتی ہے تصویرِ تمنا میں
کہ افسردہ دلی میں خونفشانی لالہ کاری ہے

اسی کے بل پہ انساں روزِ اوّل معرکہ جیتا
اسی سے آج تک قولِ متیں میں استواری ہے

محبت ہی ازل میں رازِ تخلیقِ دو عالم تھی
اسی کا شش جہت میں آج تک فرمان جاری ہے

یہودی برہمن گبر و مسلماں ہو کہ عیسائی
محبت دل کی دیوی ہے ہر اک اس کا پُجاری ہے

یہی ناقہ یہی محمل یہی لیلیٰ یہی مجنوں
ہیں شکلیں مختلف لیکن اسی کی پردہ داری ہے

اسی سے گلشنِ ہستی کے ہر شے ہے تروتازہ
یہ کلیوں کا تبسّم ہے یہی بادِ بہاری ہے

اسی تک ہے بقائے سوز و سازِ محفلِ ہستی
ازل سے اس کو حاصل دو جہاں کی راہداری ہے

یہی رہتی ہے ہر جاندار کے پہلو میں دل ہو کر
یہ وہ فطرت ہے ہر ذی روح میں جو اضطراری ہے

حسنؔ ممکن ہے فرمانا بجا ہو آپ کا لیکن
مجھے باور نہیں آتا محبت اختیاری ہے

جو اہلِ ہوش ہیں ان کو علاقہ کیا محبت سے
جو دل رکھتے ہیں ان کے واسطے بے اختیاری ہے

حسبِ فرمائش جناب سر عبدالقادر صاحب بالقابہ لندن میں لکھا گیا اور حلقۂ ادب کے جلسے میں بتاریخ
23 مارچ 1939 جناب شاکر محمدی صاحب کے دولت کدے پر پڑھا گیا
10 مارچ 1939

آنکھوں کا چار ہونا دونوں کا مسکرانا
کچھ بھید اس نے پایا کچھ رمز میں نے جانا

خاموش فرطِ غم میں یہ اشکِ خوں بہانا
کیوں ہو ستم شعاری کے واسطے بہانا

کیسے کہوں کہ اس میں میری خطا نہیں ہے
سمجھا گئے وہ سب کچھ اور میں نے کچھ نہ جانا

قسمت میں ہیں اُسی کے صرصر کے تُند جھونکے
جس شاخ پر بنایا ہے میں نے آشیانا

سمجھاؤں کیسے ان کو یہ بے خودی کا عالم
ہر چیز بھول جانا اک ان کا یاد آنا

کچھ سوچیۓ تو آخر یہ گھر ہے آپ ہی کا
دل پر ہنسی ہنسی میں کیوں بجلیاں گرانا

افشائے رازِ الفت کردے تو آپ جانیں
محفل میں ایک مجھ سے آنکھوں کا یہ چُرانا

ہم روئدادِ فُرقت اپنی سُنا رہے ہیں
وہ پُوچھتے ہیں آخر کس کا ہے یہ فسانہ

ہاں یاد ہیں ہمیں بھی وہ خواب کی سی باتیں
پل بھر کو ان کا آنا بیٹھے بغیر جانا

کون و مکاں بھی ان کا ہے لامکاں بھی ان کا
اس بے بضاعتی پر میرا یہ مسکرانا

ہر چیز میں نمایاں ہے عکسِ رُوئے انور
پھر بھی نہیں کوئی شئے ہستی کی تجھ سے مانا

میں کہہ رہا ہوں 'ارنی' دعویٰ غلط نہیں ہے
کیوں لن ترانیوں سے مجھ کو عبث ڈرانا

کیوں پُوچھتے ہو مُجھ سے کیا مُدعائے دل ہے
ہے آپ کے تجاہل میں رنگِ عارفانہ

دُشواریاں محبت کی راہ میں نہیں ہیں
مشکل ہے گر حسؔن تو پہلا قدم اٹھانا

باصرار محبی عبدالحق صاحب

15 مارچ 1939 لندن

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

مریضِ دردِ اُلفت کی دوا کیا
ابھی آیا نہیں وقتِ دُعا کیا

پریشاں خاطری، بے اعتباری
کہا کیا میں نے اور اُس نے سُنا کیا

نہیں منظور اس کو خیر قاصد
سوالِ وصل پہ آخر کہا کیا

سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا
کہ مجبوری میں یہ چُوں و چرا کیا

یہ سرگوشی یہ دُزدیدہ نگاہیں
عدو نے بھید میرا پا لیا کیا

نہیں تعذیر کے قابل مرا دل
کہ دیوانہ ہے وہ اُس کی سزا کیا

ستم ہے یہ تری ابلہ فریبی
بتاؤں تجھ کو اپنا مُدعا کیا

دلِ ناداں تجھے کیا ہو گیا ہے
دُعا کے ساتھ حرفِ مُدّعا کیا

سرِ محفل عدو کی چشمکیں ہیں
اشارہ آپ کا کچھ پا لیا کیا

چلے ہیں آج سُوئے دَیر واعظ
سمائی آپ کے سر میں ہوا کیا

سرِ پائے بُتاں یہ سجدہ ریزی
خدا نے شیخ کو دکھلا دیا کیا

محبت میں شکر رنجی نمک ہے
نہ ہو یہ چاشنی تو پھر مزا کیا

عدو مردودِ بزمِ یار اچھا
ذرا میں بھی سنوں اُس نے کہا کیا

کوئی فریاد اس کو یا نہیں ہے
نہیں کچھ آپ کو خوفِ خدا کیا

معاذ اللہ! مرا صحرائے وحشت
حدودِ لامکاں سے جا ملا کیا

جفا تیری شریکِ حالِ دل ہے
کہوں میں تجھ سے اپنا مُدعا کیا

نہ اٹھنا تھا حسؔن سجدے میں گر کر
سرِ شوریدہ کو آخر ہُوا کیا

زمیں غالبؔ کی چھوٹی بحر حسرؔت
نہ نکلے شعر تو میری خطا کیا

باصرار مجی سید احمد ترمذی از حیدر آباد دکن

9 جون 1939 لندن

عیشِ چندروزہ

آنکھوں میں پھر رہی ہیں لیوسرن کی فضائیں
آزادیوں میں گزرا ہے اک عجب زمانہ

رنگین وادیوں میں وہ جوئبار شیریں
حدِّ نگاہ تک وہ سبزے کا لہلہانہ

مستِ سُرود طائر محوِ خرام آہو
شاخوں کے جُھومنے میں انداز والہانہ

ہر وقت بیل بُوٹے رقصاں تھے چار جانب
پتّوں کی تالیوں پر ہر دم نیا ترانہ

وہ پُر سکوں فضائیں راتوں کی خاموشی میں
شفّاف آسماں پر تاروں کا جگمگانا

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے داروئے خواب آور
بیداریوں کا ضامن چڑیوں کا چہچہانا

انداز ساقیانہ کیا دلنواز تھا وہ
موجوں کا بڑھ کے ساحل کی تشنگی بُجھانا

وہ کشتیٔ دخانی کی سامعہ نوازی
موجوں کا رقصِ پیہم کے واسطے بہانا

جھیلیں پہاڑ سبزہ پھل پُھول بیل بُوٹے
انساں پرند و حیواں جنت کا کارخانہ

ہر چیز دلربا ہر شے جاذبِ نظر تھی
اس میں نہیں ہے اصلاً اغراقِ شاعرانہ

دستارِ کوہ گویا چشمک زنِ فلک تھی
جھیلوں نے آسمانی ہونا بھی مار جانا

یہ چرخِ ناتواں ہیں پر کیوں نہ بار گزرے
اس کی ستم شعاری کو تھا یہ تازیانہ

سنتے ہوں واں حوادث بھیجے ہوں اس نے پیہم
سو طرح سے ہے چاہا اس رنگ کو مٹانا

تریاقِ زہر غم تھا جھیلوں کا صاف پانی
ممکن نہ تھا فصیلوں میں تیرِ غم در آنا

رنج و محن کا لشکر گم کردہ راہ لوٹا
پُر پیچ وادیوں میں مشکل تھا راہ پانا

القصّہ آسماں نے ایسی شکست کھائی
مدت سے سرنگوں ہے اس کو ہرا زمانہ

جورِ فلک سے ایمن ہے ایک بس یہ خطہ
ہے ورنہ اس کے ناوک کا ہر کوئی نشانہ

جاندار اور بے جاں غرقِ شرابِ عشرت
بس اک شغل ہے سب کا اونچے سُروں میں گانا

حُسنِ ملیح واں کی دوشیزگاں کا کونہ
بہزاد کو نہ آیا یہ خال و خط بنانا

شانوں پہ ان کی زلفیں دونوں طرف سنہری
دو سانپ کی حفاظت میں حُسنِ کافرانہ

آنکھوں میں اس بلا کی شوخی بھی ہے حیا بھی
شرمائے جن کے آگے چشمِ غزالِ رعنا

گفتار میں حلاوت، رفتار میں نزاکت
غیرت دہِ تکلّم خاموش مُسکرانا

پوشش کی سادگی پر قربان سو بناوٹ
حورانِ خُلد ہوں تو شاید ہوں ان سے مانا

دلچسپ و دلربا جب ان کی ہر اک ادا ہے
ممکن بھلا ہو کیونکر سب خوبیاں گنانا

اس جنتِ طرب میں غم تھا نہ کچھ ہمیں بھی
دیرینہ کلفتیں واں سب ہوگئیں فسانہ

کچھ ہوش تھا نہ اپنا غم تھا نہ دُوسروں کا
اک بے خودی کے عالم میں شعر گنگنانا

ہم جورِ آسماں سے ایمن تھے دن کچھ ایسے
جیسے یہی رہے گا گویا سدا زمانہ

یہ سادگی ہماری تھی لائقِ تاسّف
سمجھے تھے دائمی ہم کلیوں کا مُسکرانا

لیکن وہاں کسے تھی مہلت یہ سوچنے کی
ہوجائینگی یہ باتیں اک خواب کا فسانہ

دن رات ہو جہاں پر بارانِ کیفِ مستی
مستوں کو ہوش کیسا ہشیار ہو دوانا

لیوسرن سے نکل کر پھر ہیں فلک کی زد میں
یہ منتقم بلا کا ضرب المثل پُرانا

اب اس کی شدّتیں ہیں پہلے سے بھی زیادہ
یہ خوب جانتا ہے کمزور کو ستانا

ساری کسر نکالے گا واں کی اب یہ ہم سے
عضوِ ضعیف پر ہے نزلہ اسے گرانا

اک خواب تھا جو دیکھا یورپ کی وادیوں میں
اب ہم ہیں اور حسؔن پھر قصّہ وہی پُرانا

ان اگلی کلفتوں پر ہے اک بڑا اضافہ
وہ عیشِ چند روزہ رہ رہ کے یاد آنا

نظم درحالات لیوسرن سوئیٹزرلینڈ، یہ نظم لندن سے میلان سفر کرتے ہوئے ٹرین میں لکھی گئی
صبح 10 بجے سے ساڑھے بارہ بجے دوپہر کے درمیان، 9 جولائی 1939

جس دل پہ کی نگاہِ کرم دل بنا دیا

دل کو اسیرِ شوقِ سلاسل بنا دیا
یُوں تیرے التفات کے قابل بنا دیا

ناکامیوں کو عشق کا حاصل بنا دیا
جس کو نہ ہو قرار اسے دل بنا دیا

راہِ وفا میں دوریٔ منزل کا ذکر کیا
جس جا قدم رُکا اسے منزل بنا دیا

یہ مادّہ پرست نگاہوں نے کیا کیا
تیرا ہی عکس تیرے مقابل بنا دیا

کہیے فسونِ عشق کا ایک معجزہ اسے
ذرّاتِ کائنات کو محمل بنا دیا

خنجر گلے پہ رکھ کے اٹھایا ستم کیا
بسمل کو تو نے اور بھی بسمل بنا دیا

توبہ خمارِ بادۂ پندار دیکھیے
زاہد سے ہوشیار کو غافل بنا دیا

حُزن و ملال و یاس و الم کے خمیر سے
جو شے بنی اُسی کو مرا دل بنا دیا

ہر ماسوا سے پھیر کے دل کو بصد نیاز
تیری نگاہِ لطف کے قابل بنا دیا

میں خود کبھی سوال نہ کرتا خدا گواہ
دستِ کرم نے آپ کا سائل بنا دیا

دیوانگی میں ہوش ہمیں ہے بس اس قدر
جوشِ جنوں کو رہبرِ منزل بنا دیا

مشکل ہے ان کو قُربِ رگِ جاں میں ڈھونڈنا
آسانیوں نے کام کو مشکل بنا دیا

دل کو حقیقتوں سے کیا تم نے رُوشناس
ہر شے کو نقشِ ہستیٔ باطل بنا دیا

ہاں اس یقین ہی نے کہ تُو کارساز ہے
دل کو حریصِ مطلبِ مشکل بنا دیا

مجھ سے ضعیف اور یہ بارِ گرانِ عشق
امیدِ لُطف نے متحمل بنا دیا

میں نے نکل کے آپ کی بزمِ نشاط سے
ہر دشت و در کو آپ کی محفل بنا دیا

اک پرتوِ شعاعِ تجلّیٔ یار نے
حیرانیوں کو زینتِ محفل بنا دیا

تنگ آ کے ہم نے بحرِ حوادث میں اے حسنؔ
گردابِ مشکلات کو ساحل بنا دیا

آل انڈیا مشاعرہ نمائش اٹاوہ
12 دسمبر 1939

ہر پردہ درمیاں سے اُٹھاتا چلا گیا

مُجھ کو حریصِ دید بناتا چلا گیا
جلووں میں اپنے خود کو چھپاتا چلا گیا

وہ رفتہ رفتہ سامنے آتا چلا گیا
ہاں لن ترانیاں بھی سُناتا چلا گیا

منزل کا دشتِ عشق میں کوئی پتہ نہ تھا
یہ اضطراب راہ دکھاتا چلا گیا

ساقی کو مجھ پہ ناز ہے ساقی کے میں نثار
میں پی رہا تھا وہ بھی پلاتا چلا گیا

یہ رہ نوردِ کوئے تمنّا کے حوصلے
دل کو رہینِ یاس بناتا چلا گیا

کم ہو سکا نہ وعدۂ فردا سے اضطراب
یہ اشتیاقِ دید بڑھاتا چلا گیا

صحرائے لامکاں میں جنوں لے گیا مجھے
میں ہوش کی حدوں کو مٹاتا چلا گیا

تلقینِ صبر تھی کہ مرا امتحان تھا
وہ میری مشکلات بڑھاتا چلا گیا

مجھ کو نظر فریب مناظر دکھا دیے
پھر کیسے دل نہ ہاتھ سے جاتا چلا گیا

جولاں گہِ خرد سے بھی آگے سوارِ عشق
رخشِ سُبک عناں کو بڑھاتا چلا گیا

آگاہ کرکے مجھ کو صفاتِ خودی سے وہ
میرے تصوّرات میں آتا چلا گیا

ان بے نیازیوں پہ ترا نازِ دلبری
دل کو نیازِ عشق سکھاتا چلا گیا

درسِ نیازِ عشق مجھے یاد کب ہوا
میں بُھولتا رہا وہ بتاتا چلا گیا

یوں رفتہ رفتہ نقشِ دُوئی خود بخود مٹا
میں اس میں اور وہ مُجھ میں سماتا چلا گیا

یہ اعتبارِ وعدۂ لا تقنطو حسنؔ
مایوسیوں میں دِل کو بڑھاتا چلا گیا

اُردو ہفتہ
28 جنوری 1940

تضمین بر نظم مسٹر فضل احمد کریم فضلؔی آئی سی ایس

حسن عبداللہ حسؔن

ذرا سانس لینے تھے دردِ نہانی دکھا زورِ تاثیر معجز بیانی
کہ آج اِس دلِ مضطرب کی زبانی "سُنانی ہے مجھ کو عجب اک کہانی"
"نہ ایسی نئی ہے نہ ایسی پُرانی"

اسے آپ سمجھیں گے عربوں کا قصّہ کہے گا کوئی ہے یہ تُرکوں کا قصّہ
زمانہ بتائے گا صدیوں کا قصّہ "نہ سنیے اگر تو ہے غیروں کا قصّہ"
"اگر دل سے سنیے تو اپنی کہانی"

کبھی چشمِ غفلت سے پردہ اٹھے گا تو حالِ زبوں آپ پر سب کھلے گا
پھر انصاف سے خود ہی کہہ دیجئے گا "کہیں ہم تو کوئی بھی باور کرے گا"
"کہ ہم نے بھی کی تھی کبھی حکمرانی"

کچھ اس شان کی عبدیت تھی ہماری کہ ضرب المثل حرّیت تھی ہماری
ہم اس کے تھے یہ شخصیت تھی ہماری "خدا کی زمیں ملکیت تھی ہماری"
"خدا کی خلافت کی تھے ہم نشانی"

بھری تھی خزانوں میں دنیا کی دولت ہمارے قدم بڑھ کے لیتی تھی عزّت
نہ تھی نام کو بھی مگر سر میں نخوت "زمیں پر ہی کرتے نہ تھے ہم حکومت"
"رعایا کے دل میں بھی تھی راجدھانی"

وہ دن حق پسندی کے تھے جب نہیں تھی سیاست کی بنیاد ابلہ فریبی
کہہ و مہہ سب آپس میں تھے بھائی بھائی "دلوں میں امیروں کے دردِ غریبی"
"غریبوں کے چہروں پہ تھی شادمانی"

ہمارے ضعیفوں میں زورِ کمالی جواں منکسر ہمتیں ان کی عالی
ہماری خوشی تھی رضائے الٰہی "ہمارے امیروں میں عجزِ فقیری"
"ہمارے غریبوں میں شانِ کیانی"

ہر انسان کو ایک صف میں بٹھایا اک اللہ کے آگے سب کو جُھکایا
نسب پر تفاخر کو بے جا بتایا "غلاموں کو بھی ہم نے آقا بنایا"
"اچھوتوں کو دی دولتِ حکمرانی"

عرب کے بیاباں کو گلشن بنایا عجم کو بھی رشکِ جناں کر دکھایا
حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا "زمانے کے مُردہ فنوں کو جلایا"
"جہاں ہم گئے جاگ اٹھی زندگانی"

مسلمان زندہ جو تھا کس لئے تھا وہ زندہ دل اک غیرتِ حس لئے تھا
یہ سن لو وجود اپنا یاں جس لئے تھا "ہماری رگوں میں لہو اس لئے تھا"
"کہ ہو خدمتِ دین و ملّت میں پانی"

چڑھی حیف مستی حکومت کی ایسی گھٹا چھا گئی کبر و نخوت کی ایسی
چکھی چاشنی خوابِ غفلت کی ایسی "چلی پھر ہوا عیش و عشرت کی ایسی"
"کہ خود سو گئے کہتے کہتے کہانی"

ہم آئے تھے مامور ہو کر اسی پر   جگائیں دو عالم کو سوتے سے یکسر
ہم ہی سو گئے سوتی بستی جگا کر   ''جو سوئے تو ایسے کہ اللہ اکبر''
''اذاں کی بھی آواز ہم نے نہ جانی''

چڑھالی تھی وہ دارُوئے خواب آور   جو بیدار ہونے نہ دے پھر سُلا کر
کبھی چھوڑتے ہم نہ یہ نرم بستر   ''جگایا ہمیں کس نے ٹھوکر لگا کر''
''بڑی مہربانی بڑی مہربانی''

جو جاگے تو آئی نظر اپنی حالت   وہ غفلت گئی وا ہوئی چشمِ عبرت
عداوت ہوئی اپنے حق میں عنایت   ''اسی مہربانی کی ہے یہ کرامت''
''کہ بوڑھی رگوں میں ہے جوشِ جوانی''

سب آثار بیداریوں کے عیاں ہیں   نظر آرہا ہے کہاں تھے کہاں ہیں
زن و پیر کودک سبھی رجز خواں ہیں   ''جوانوں کا کیا ذکر آخر جواں ہیں''
''بنیں گے وہ اک روز قاسم زمانی''

اُلٹ دیں صفوں کی صفیں بے محابا   پلٹ دیں زمانے کی دم بھر میں کایا
وہ گزرا ہوا لوٹ آئے زمانہ   ''وہی پھر ہو اقبال کا دور دورہ''
''لگے پھر قدم چُومنے کامرانی''

ہے ایمان ہی حاصلِ دین و دنیا   اسی پر ہے جینا اسی پر ہے مرنا
خدا کی رضا جوئی ہے اپنا شیوہ   ''کرے کون نام اور دنیا کی پروا''
''نہ یہ جاودانی نہ وہ جاودانی''

جنہیں ناز قوت پہ ہو وہ صدا دیں   نبرد آزما جن کو ہونا ہوں آئیں
وہ ڈرتے نہیں موت سے جو یہ سمجھیں   ''لہو سے شہیدوں کی بنتی ہیں قومیں''
''شہیدوں کی ہے زندگی غیر فانی''

ہے خُم خانۂ دل میں پھر بادہ نوشی نئے سر سے پیدا ہوئی گرم جوشی
جنونِ عملِ کہیئے یا چارہ کوشی "دلوں میں نہاں جذبۂ سر فروشی"
"عیاں ہے نگاہوں سے دردِ نہانی"

قیامت ہے شیروں کا بیدار ہونا زمانے نے دیکھا ہے اس کا تماشا
ابھرنے لگا غیرتِ دیں کا جذبہ یہ جذبہ اگر جلد ہو کار فرما
"تو مشکل نہیں اب بھی بگڑی بنانی"

سزا ہم نے جب خوب غفلت کی پالی کرم نے ترے ہم کو عزّت دلائی
بس اب شرم کی شرم رکھ لے الٰہی "نہ کام آئی جو دین وملّت کے اپنے"
"وہ کس کام کی ہے الٰہی جوانی"

دلوں پر جو دھبّے پڑے ہیں مٹا دے یہ آئینے دھندلے ہیں ان کو جلا دے
نقاب اپنے چہرے سے ہاں پھر ہٹا دے "پھر اک بار تو اپنا جلوہ دکھا دے"
"بہت غیر کرنے لگے لن ترانی"

بس اب سن بھی لے ان کی فریاد و زاری حدوں سے بھی آگے بڑھی ان کی خواری
یہی ہے خدایا تمنّا ہماری "مسلماں کو پھر کر دے اپنا بھکاری"
"بنادے بھکاری کو شاہِ زمانی"

جو فضلؔی کو کہنا تھا سب کہہ چکے ہیں حسنؔ ہم یہ انداز پہچانتے ہیں
تکلّف میں بے وجہ فرمارہے ہیں "بس اب ختم کر لوگ گھبرا گئے ہیں"
"بہت سن چکے تیری فضلؔی کہانی"

علی گڑھ

27مارچ1940

عشق وہاں ہے فاضلِ دوراں
عقل جہاں اک طفلِ دبستاں

دیکھئے بدلا رنگِ گلستاں
قید سے چھوٹا قیدیٔ زنداں

بادۂ احمر خونِ رگِ جاں
پنبۂ دُنیا شمعِ شبستاں

حُسن کی ایما صبر و توکّل
اور دلِ مضطر حشر بداماں

منزلِ اُلفت جادۂ ظلمت
قلبِ حزیں اک شمعِ فروزاں

مہرِ تجلی لطف پہ مائل
قطرۂ شبنم لرزاں لرزاں

بات یہ کیا ہے آج یہ کیوں ہے
پھیکا پھیکا رنگِ گلستاں

حُسنِ ازل کی ایک جھلک سے
دل ہے ابھی تک حیراں حیراں

آپ ہی اپنی آگ میں جلنا
دل بھی عجب ہے سوختہ ساماں

سجدوں میں طے ہو جادۂ الفت
اللہ اللہ شوقِ فراواں

حُسنِ حقیقت حُسنِ عقیدت
عینِ حقیقت چشمِ غزالاں

جور و ستم ہے لطف و کرم ہے
پیدا پیدا پنہاں پنہاں

یاد ہمیں پیمانِ ازل تھا
آپ نے کیوں کی زلف پریشاں

کام کوئی دشوار نہیں ہے
ہمّتِ مرداں مشکل آساں

خیر ہو یا رب! زخمۂ دل نے
چھیڑ دیا پھر تارِ رگِ جاں

یاں کا یہ احسان ہے دل پر
نَے غمِ عشق و نَے غمِ دوراں

سوزِ محبت شمعِ ہدایت
پیشِ نظر ہے چشمۂ حیواں

چھیڑ دے تُو اک بار تو پھر ہو
سازِ اناالحق تارِ رگِ جاں

اس کی نگاہِ مست کے صدقے
میری نظر ہے کیف بداماں

حُسن کی منزل عشق سے پوچھو
عقل ہے جو سربستۂ حیراں

علم حجابِ اکبرِ دل ہے
جہل چراغِ جادۂ عرفاں

عشق حسنؔ کیا آفتِ جاں ہے
میں بھی پریشاں وہ بھی پریشاں

یہ غزل رگھوپت سہائے فراق کی غزل پر مسوری میں لکھی گئی
19 جون 1940

اس آستاں پہ اپنی جبینِ نیاز ہے

مضرابِ غم جو تارِ رگِ جاں نواز ہے
رُودادِ زیست نغمۂ سوز و گداز ہے

یہ حُسنِ دلنواز کی نظّارہ سوزیاں
ہر شے میں آشکار مگر پھر بھی راز ہے

عیشِ نیازِ عشق ہے تسلیمِ بندگی
مہر و وفا سے قلبِ حزیں بے نیاز ہے

نقشِ قدم پہ سجدہ کناں جارہا ہوں میں
مذہب مرا جنوں ہے یہ میری نماز ہے

کمزور جان کر مجھے کرتا ہے سرزنش
وہ دیکھ محتسب درِ میخانہ باز ہے

بس بس! علاجِ راحتِ رنج آفریں نہ ہو
رازِ حیات عشقِ جنوں چارہ ساز ہے

دل خُوگرِ جفا جو ہُوا، کم ہوئی جفا
مجھ کو تری نگاہِ مرّوت پہ ناز ہے

ہاں برقِ حُسن اس میں ہیں آسودہ بجلیاں
دل کیا ہے ایک خرمنِ شعلہ نواز ہے

اس کو تلاش قُربِ رگِ جاں میں کیجیے
زاہد! مگر یہ منزل دُور و دراز ہے

ناکامیوں نے دل کو پریشان کردیا
لیکن مجھے یقین ہے تُو کار ساز ہے

انصاف کی امید جو زاہد کو ہو تو ہو
ہم عاصیوں کو آپ کی رحمت پہ ناز ہے

قسمت کو دشمنیٔ دلِ زار میں حسنؔ
اس کی نگاہِ ناز سے کچھ ساز باز ہے

آل انڈیا مشاعرہ مسوری
23جون1940

میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

وہ تنگِ سینہ ہے جو آہ دلگداز نہیں
وہ درد، درد نہیں ہے جو دلنواز نہیں

نہیں وہ ملتفتِ دل وہ بے نیاز نہیں
مجھے تحملِ بارِ گرانِ راز نہیں

نقاب رُوئے حقیقت اٹھانے والی ہے
مری نگاہ کہ اب مائلِ مجاز نہیں

حدیں جو چاہیں لگائیں جنابِ شیخ مگر
نہ ہو جو ساز اناالحق وہ دل کا ساز نہیں

سُنے سُنے نہ سُنے میں دُعا کیے جاؤں
وہ بے نیاز ہے بندہ تو بے نیاز نہیں

اسی سے شکوۂ کوتاہِ دستیٔ قسمت
جو کار ساز ہے اور پھر بھی کار ساز نہیں

نہ باریاب ہوں محفل میں میں مگر یہ ستم
جبینِ شوق ترے در سے سرفراز نہیں

نظر سے دُور سہی دل میں تم کو پاتا ہوں
شبِ درازِ جدائی بھی اب دراز نہیں

بشانِ شمع تری بزم میں بھی جلتا ہوں
وصال و عالمِ ہجراں میں امتیاز نہیں

مُجھے شفا نہ ہوئی کیوں تجھے خجالت ہے
ترا قصور کوئی اس میں چارہ ساز نہیں

ہزار عیب ہوں جس میں وہ احسنِ تقویم
کہیں نیاز ہی میرا تو وجہِ ناز نہیں

زباں خموش ہے صورت سوال ہے میری
نہ آشکار ہو تم پر وہ دل کا راز نہیں

یہ شیخ جُبہ و دستار سجۂ تزویر
یہ بزمِ بادہ کشاں در خورِ جواز نہیں

وہ کاش چھیڑ دے پھر پردۂ نوائے الست
کہ آج بربطِ جاں زمزمہ نواز نہیں

ہمیں یہ ضد کہ جو پانا ہو بے طلب پائیں
انہیں یہ ناز کہ دستِ طلب دراز نہیں

جُھکا سکیں جسے اصلا نہ سطوت و جبروت
بجز گدائے غلامِ شہہِ حجاز نہیں

مجھے معاف ہی رکھئے حسؔن کہ میں ہرگز
حریفِ صحبتِ رندانِ پاکباز نہیں

بزمِ اقبال آگرہ
21 ستمبر 1940

ردیف گئی۔ قافیہ بے قید

صرصر و برق سُست ہیں زحمتِ آسماں گئی
قید میں وہ سکوں ملا حسرتِ آشیاں گئی

مجھ کو نیازِ وجہہ ناز اس کی نظر وفا شناس
کشمکشِ دلِ حزیں از پئے امتحاں گئی

رہبرِ عشق لے گیا بابِ حریمِ قُدس تک
واعظ و محتسب چُھٹے دہشت ایں و آں گئی

روحِ الست کی شمیم گلشنِ جاں میں پھر چلے
صورتِ گلستاں تو ہے نکہتِ گلستاں گئی

اب ہے وہ مُردہ زندگی جس سے ہے موت خوب تر
باغ میں آشیاں رہا الفتِ باغباں گئی

اس کی نگاہِ ناز سے راز و نیازِ عشق ہے
سجدۂ بے نیاز ہاں نازشِ آستاں گئی

ناصحِ عشق اور میں دونوں کو دعویٔ خلوص
سلسلۂ جنوں دراز بات کہاں کہاں گئی

قوتِ شامہ نہیں تازہ مشامِ جاں ہو گیا
بُوئے شمیمِ جانفزا حیف کہ رائیگاں گئی

عشق کے میکدے میں ایک جرعۂ درد مل گیا
آ گیا ہوش سر بسر کلفتِ دو جہاں گئی

بارِ امانتِ عظیم تُو نے اٹھا لیا تھا کیوں
حوصلہ اب وہ کیا ہُوا تاب و تواں کہاں گئی

خونِ دل حزیں ہُوا راہِ جنوں میں جس جگہ
جُملہ لطافتوں کے ساتھ اس کی نظر وہاں گئی

تیری حریمِ ناز تک آہ کا ہو گزر نہ ہو
دل سے نکل کے بارہا تا سرِ لامکاں گئی

قلبِ حزیں کی حیرتیں لائقِ دید ہیں حسنؔ
آ کے قریبِ آشیاں برق بھی پرُفشاں گئی

دی گرینڈ آل انڈیا مشاعرہ
سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ
30 نومبر 1940

قطعہ

حامد کی ضد کہ میں آج غزل پڑھوں ضرور
طعنہ جوابِ اعتذار ذہنِ رسا کو کیا ہوا
میں نے کہا کہ بحر کیا ہوگی بس اتنا کہہ دیا
میں نے کہا قافیہ اس نے کہا ادا قضا
میں نے کہا ردیف کیا؟ اُس نے کہا ''کو کیا ہوا''
میں نے یہ مطلع سر کیا سُن کے وہ جھومنے لگا
میں نے کہا کہ محترم فکرِ رسا کو کیا ہوا

بہ اصرار مُحبی و مشفقی مولوی سید حامد علی صاحب ہیڈ مولوی وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ
7 دسمبر 1940

حُسنِ طلب ہے رائیگاں آہِ رسا کو کیا ہُوا
اب ہیں وہ مائلِ کرم شوقِ جفا کو کیا ہُوا

فصلِ بہار باغ میں آئی گئی ہزار بار
غنچۂ دل نہ وا ہُوا بادِ صبا کو کیا ہُوا

شغلِ نیازِ عشق ہے سجدۂ بے نیازِ شوق
بابِ قبول وا نہ ہو دستِ دُعا کو کیا ہُوا

میرے خدا یہ بے کسی کس سے کہوں میں حالِ دل
ہنس کے وہ شوخ یوں کہے تیرے خدا کو کیا ہُوا

بندۂ حرص و آز کیوں نام و نمود کی ہوس
رازِ بقا فنا میں ہے ذوقِ فنا کو کیا ہُوا

خُوں ہُوا دلِ حزیں دشتِ بلا ہے موج خیز
ناقۂ سوارِ ناز دیکھ، برہنہ پا کو کیا ہُوا

سر میں خودی کی بُو نہ ہو ہے یہی شرطِ بندگی
مستِ مئے خرد ہوں میں تیری ادا کو کیا ہُوا

قافلہ محوِ خواب ہے موت ہے یہ کہ نیند ہے
کون ہے میرِ کارواں بانگِ درا کو کیا ہُوا

دستِ طلب کی شرط کیا راہِ نیازِ عشق میں
میری زباں خموش ہے تیری عطا کو کیا ہُوا

سرحدِ قُدس کے قریب چھوڑ کے چل دیا مجھے
میں تو ہوں باریابِ حُسن راہ نما کو کیا ہُوا

باغ میں کوند کر حسنؔ تا سرِ آشیاں گئی
پُھونک سکی نہ آشیاں برقِ بلا کو کیا ہُوا

آگرہ
7 دسمبر 1940

زندگی کا راز کیا ہے زندگی خود راز ہے

جس بُلندی پر ترا حُسن کرشمہ ساز ہے
میری پیشانی وہاں اک فرشِ پا انداز ہے

آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز اک اعجاز ہے
بارہا افشا ہُوا لیکن ابھی تک راز ہے

آپ کا آنا مرے گھر باعثِ اعزاز ہے
طالعِ برگشتہ شاید ان دنوں دمساز ہے

شکوۂ بیداد کیسا آپ بیٹھے تو سہی
ہر صدائے دردِ دل اک نغمۂ بے سازِ ہے

کس قدر دلچسپ تھا وہ نغمۂ سازِ الست
تو صدا دے یا نہ دے دل گوش بر آواز ہے

گوشِ شنوا نے سنی جب دعوتِ استفتحو
دی گواہی دل نے پہچانی ہوئی آواز ہے

ایک مُشتِ خاک کا یہ پایۂ حُسنِ قبول
آپ کو مجھ پر مجھے اپنی وفا پہ ناز ہے

کیوں نظر آتی ہیں کاہیدہ قفس کی تیلیاں
مرغِ جاں صیّاد شاید مائلِ پرواز ہے

سجدہ ریزی ہے ثبوتِ پاسِ شرطِ بندگی
بے نیازِ سجدہ ورنہ آستانِ ناز ہے

اکتسابِ درس خود داری ہے رازِ معرفت
زاہدو ! خود اعتمادی عشق کا آغاز ہے

پھر بہار آئی ہوائیں مست پھر چلنے لگیں
پھر طبیعت چارہ گر بیمار کی ناساز ہے

دم بہ دم آتی ہے لا خوفِ علیہم کی صدا
دل ہے اک مضراب ہر تارِ نفس اک ساز ہے

آپ کا حکمِ فلا تنھر ہے ہمّت آفریں
بندہ سائل ہے اسیرِ دامِ حرص و آز ہے

کیجیے بیداد عذرِ آزمایش کیا ضرور
بے تکلّف آپ کا انداز خود غمّاز ہے

کیا ضروری ہے حسنؔ ہو ماہرِ علمِ عروض
شاعرِ خوش فکر دانائے رموزِ راز ہے

خیرہ چشمی ہے حسنؔ دیکھا ہے جب سے حُسنِ یار
کچھ نظر آتا نہیں گو چشمِ حیرت باز ہے

بزمِ ادب مینڈو ضلع ہاتھرس کا سالانہ آل انڈیا مشاعرہ
27 دسمبر 1940

ابھی شاخیں نظر آتی ہیں اشجارِ بیاباں کی

ہے دل ہی زینتِ محفل خبر ہے سوزِ پنہاں کی
ہُوئی جاتی ہے مدہم روشنی شمعِ فروزاں کی

بڑھا کر عظمتیں تُو نے مرے تارِ رگِ جاں کی
عنایت ہے کہ میری منزلِ دشوار آساں کی

جبل جس کے تصوّر کا تحمّل کر نہیں سکتے
وہی بارِ گراں تقدیر میں آیا ہے انساں کی

فضائے بامِ عرفاں تک پہونچنا چاہتا تھا میں
عطا کی دل نے مجھ کو نرَدباں تارِ رگِ جاں کی

دلِ گُم کردہ ظلمات سے باہر کہاں آتا
بنی شمعِ ہدایت خود تجلی نورِ عرفاں کی

خزاں دیدہ چمن میں وہ شمیمِ جانفزا آئی
کہ صورت ہی بدل دی جس نے تقدیرِ گلستاں کی

وہی گلشن ہے جو فصلِ خزاں میں رشکِ جنّت تھا
بہاراں میں اسی پر صدقے ویرانی بیاباں کی

پہنچ کر آخری منزل پہ بھی منزل نہیں ملتی
مگر ہے سعیِ پیہم ہی رضا شوقِ فراواں کی

وہ مشتاقِ اسیری ہوں کہ تیرے اک اشارے پر
مرے چاروں طرف بن جائے خود دیوار زنداں کی

تجھے لازم ہے کچھ تو پاسِ آئینِ وفاداری
بس اے شوریدگی کمزور ہے دیوار زنداں کی

متاعِ غم کو اپنی مِلک ازل سے دل سمجھتا ہے
وہی جنسِ گراں جلوؤں نے ظالم تیرے ارزاں کی

ترے جلوؤں کی کثرت اب مجھے شرمندہ کرتی ہے
شکایت ہو رہی ہے خود مجھے تنگیٔ داماں کی

شُعائیں نُورِ عرفاں کی یہیں سے پھوٹ نکلیں گی
یہ الزامِ جنوں توہین ہے چاکِ گریباں کی

مرے آنسو کا ہر قطرہ ہے وجہِ نازشِ رحمت
اُٹھاؤں منّتیں کس واسطے میں ابرِ نیساں کی

حدیں تا واجب و ممکن کی مل جائیں بہم دیگر
تجھے اس واسطے سونپی صدارت بزمِ امکاں کی

حسؔن رندِ حقائق گو اگر ہے تو تعجب کیا
سراسر جھوٹ بکنا ہی تو خُوبی ہے غزلخواں کی

مشاعرہ فتح پور سیکری
16 جنوری 1941

مضرابِ غم کو مطربِ دمساز دیکھنا
خاموش کیوں ہے دل کا مرے ساز دیکھنا

سرمایۂ حیات ہوئی شورشِ جنوں
دیوانگیٔ شوق کا آغاز دیکھنا

دل اک تڑپ میں کون و مکاں سے گزر گیا
بے بال و پَر کی قوّتِ پرواز دیکھنا

عرضِ نیازِ عشق ہوئی وجہ برہمی
برگشتگیٔ طالعِ ناساز دیکھنا

دل پر فضائے ہوش و خرد تنگ ہوگئی
ان کی نگاہِ ناز کا اعجاز دیکھنا

اخفائے راز کی مجھے تاکید ہے عبث
افشا نہ کردے غمزۂ غماز دیکھنا

لبیک بے ارادہ کہا سر جُھکا دیا
تاثیرِ دلربائی آواز دیکھنا

دل میں سب ان کے جلوے سماتے چلے گئے
میرے کمالِ شوق کا اعجاز دیکھنا

نالوں سے میرے گونج رہی ہے فضائے عرش
یہ دلکشیٔ نغمۂ بے ساز دیکھنا

آشوبِ آہِ قلب حزیں بے اثر نہیں
انجام چرخِ تفرقہ پرداز دیکھنا

سر آستانِ ناز پر جُھک کر نہ پھر اٹھے
گھٹنے نہ پائے عشق کا اعزاز دیکھنا

امکان اور وجود کی ساری حدیں مٹیں
اک مُشتِ خاک کی یہ تگ و تاز دیکھنا

سر دے دیا تو زندۂ جاوید ہوگیا
انعامِ سر فروشئ جانباز دیکھنا

یاں سرکشی شعارِ سبک سار ہے حسنؔ
روزِ شمار مجھ کو سرافراز دیکھنا

انجمن ترقی اردو سینٹ جانس کالج آگرہ کا سالانہ مشاعرہ

15 فروری 1941

قریبِ آشیاں کچھ آگ سی معلوم ہوتی ہے
وہ دیکھو دُور سے کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے

نشیمن پُھونک کر بجلی نے یہ احساں کیا مجھ پر
قفس کی زندگی اب زندگی معلوم ہوتی ہے

مکلّف ہوچلی ہیں تیری درماں کوشیاں ظالم
مجھے سوزِ نہاں میں کچھ کمی معلوم ہوتی ہے

شمیمِ روحِ پرور گلشنِ جاں سے گئی لیکن
مشامِ جاں میں اب تک تازگی معلوم ہوتی ہے

عصائے موسوی قبضے میں ہے پھر خوف کیا مجھ کو
اجل بھی اک فسونِ سامری معلوم ہوتی ہے

خودی کے راز میں پنہاں ہے رازِ معرفت زاہد
یہیں پر انتہائے بے خودی معلوم ہوتی ہے

تمہاری سی نہیں ہے کوئی شے لیکن میں حیراں ہوں
کہ جو شے ہے تمہاری آرسی معلوم ہوتی ہے

گئے لاکھوں کھڑے ہیں لا تعَد اس کو بُجھانے کو
مگر تنویرِ حق بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

میں خود ہوں دل کے بس میں اور دل ہے آپ کے بس میں
یہ مجبوری رہینِ دوستی معلوم ہوتی ہے

نہیں بے وجہ رونا اور ہنسنا اور پھر رونا
دلِ وحشی میں غم کی گدگدی معلوم ہوتی ہے

چلا ہے دیکھیے دیوانہ اور اس کی معیت میں
فضائے دو جہاں چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

ہیں دعویدارِ اُلفت کس قدر بیگانۂ الفت
مجھے اس قصۂ غم پر ہنسی معلوم ہوتی ہے

فنا کے ذوق میں اتنی بڑھی ہے خودفراموشی
کہ اب رُودادِ ہستی بھی نئی معلوم ہوتی ہے

بیاں کرتے ہیں توصیف و ثنا جنّت کی یوں واعظ
کہ گویا آنکھ کی دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے

حصولِ معرفت مُضمر ہے رازِ خودشناسی میں
فنا کرنا خودی کو خودکشی معلوم ہوتی ہے

حسؔن اس وحشتِ دل نے وہاں پہنچا دیا مجھ کو
جہاں دنیائے اُلفت ہی نئی معلوم ہوتی ہے

علی گڑھ
یکم مارچ 1941ء

کٹ جائے عُمر حسرتِ دیدارِ یار میں
یہ مصلحت ہے ہستیٔ ناپائیدار میں

حرماں نصیب دل کو کبھی ہو سکوں نصیب
گزری ہے ایک عُمر اسی انتظار میں

اک معجزہ ہے شوخ نگاہیٔ چشمِ دوست
پھر جان پڑگئی دلِ امیدوار میں

بس اس قدر ہے مسئلۂ جبر و اختیار
میں خوگرِ رضا ہوں ترے اختیار میں

ہے گر یہ زیست مزرعۂ عُقبیٰ تو خوب ہے
کیا ورنہ لُطف زندگیٔ مستعار میں

میں سرکشی کروں تو سزاوارِ سرزنش
گھٹنے مگر نہ پاؤں ترے اعتبار میں

امید عیشِ رفتہ ہوئی وجہِ زندگی
اک دلکشی ہے گردشِ لیل و نہار میں

دیوانگی میں ہم نے جو صحرا کی راہ لی
گلشن میں آگ لگ گئی فصلِ بہار میں

خود زیور آئینہ کا ہے زنگارِ آئینہ
منزل کو دیکھتا ہوں حجابِ غُبار میں

آئی بہار قید ہوئے آشیاں جَلا
کیا لُطفِ زیست موسمِ ناسازگار میں

افسردگی مآلِ علاجِ جنوں نہ ہو
اک زندگی تو ہے دلِ وحشت شعار میں

میں نے بَلا کہا تھا سمجھ بوجھ کر حسنؔ
قابو میں دل تھا اور زباں اختیار میں

اٹاوہ اور آگرہ کے درمیان ٹرین کے سفر میں لکھی گئی

29 اپریل 1941ء

ستارہ اوج پر ہے ان دنوں میرے مقدّر کا

یہی عالم رہا چندے اگر جورِ ستمگر کا
کھٹکنا لُطف دیگا زخمِ دل میں نوکِ نشتر کا

ہماری شامِ غم کی عظمتوں کا پُوچھنا کیا ہے
بندھا ہے اس کے دامن سے گریباں صبحِ محشر کا

متاعِ غم کو مِلک اپنی سمجھتا ہے دلِ وحشی
نصیبِ دُشمناں کیوں ہو جو ہے میرے مقدّر کا

تصوّر میں نہیں آتے سبب اس کا یہی ہوگا
مری آنکھوں میں نقشہ ہے ابھی دیوار کا در کا

تنگ ظرفی کا طعنہ اہلِ ہمّت سن نہیں سکتے
دکھا دوں گا میں کوزے میں سما جانا سمندر کا

جمالِ ماسوا کا عکس کیوں پڑنے لگا اس میں
خدا کا آئینہ ہے دل کہ آئینہ سکندر کا

تھپیڑے موج کے بادِ مخالف دوریٔ ساحل
فنا ہوجاؤ یا بڑھتے چلو کیا ذکر لنگر کا

عدم میں تھے عدم میں پھر حیاتِ جاوداں ہوگی
وجود اس منزلِ دنیا میں اک وقفہ ہے دم بھر کا

ہُوا ہے چار میں اس طرح پر چرخِ ستم پیشہ
ثنا خواں ہوں ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ کا

سیاہی نامۂ اعمال کی کافور ہو جائے
اگر پڑجائے اس پر ایک چھینٹا دیدۂ تر کا

حسنؔ یہ آتشِ سوزاں ہجراں کی کرامت ہے
مجھے شیدا بنایا ہے اسی نے آتشِ تر کا

مشاعرہ غازیپور بر مکان مولوی غلام محی الدین صاحب بر برہنہ
13جون 1941ء

ہر اک سے پُوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

گو جانتا ہوں رمزِ دوا و اثر کو میں
الزام دے رہا ہوں مگر چارہ گر کو میں

صیقل کروں اگر نگہہِ پردۂ در کو میں
زنگارِ دل میں دیکھ لوں آئینہ گر کو میں

دیدارِ حُسنِ یار کہاں اور میں کہاں
کھو آیا بزمِ ناز میں اپنی نظر کو میں

جب سے سُنا ہے مزرعِ عُقبیٰ یہ زیست ہے
اک رہ گزر سمجھنے لگا مستقر کو میں

تاثیرِ آہِ سرد دکھاؤں تو پُھونک دوں
اک آہِ دلنواز سے ہر خُشک و تر کو میں

ہے مدّتِ حیات سے معیادِ غم فزوں
سمجھاؤں کیسے یہ دلِ شوریدہ سر کو میں

دل چاہتا ہے سیر کرے بامِ عرش کی
اُڑنا سکھاؤں طائرِ بے بال و پَر کو میں

کیفِ شرابِ ہستیٔ موہوم الاماں
اس بے خودی میں بُھول گیا اپنے گھر کو میں

ادراکِ ماسوا ہے حجابِ جمالِ دوست
سکھلا رہا ہوں ہیچمدانی نظر کو میں

کب وہ بُلائیں کب ہو سعادت مجھے نصیب
بیٹھا ہُوا ہوں باندھ کے رختِ سفر کو میں

محمول وہ کریں نہ غرض پر سلام کو
پچھتا رہا ہوں بھیج کے واں نامہ بر کو میں

لکھنی ہے مجھ کو سرخیٔ افسانۂ جنوں
خوں کررہا ہوں عشق میں قلب و جگر کو میں

وہ بارگاہِ حُسن کی سرحد پہ رُک گیا
ہُوں باریاب چھوڑ کے واں راہبر کو میں

پانے لگا ہوں نزد رگِ جاں ترا سراغ
پہچاننے لگا ہوں تری رہگزر کو میں

جو لُطف مانگنے میں ہے پانے میں وہ کہاں
اپنی دُعا کے ساتھ نہ بھیجوں اثر کو میں

ہے مجھ کو پاسِ ہمّت مردانہ چرخ پر
کیا اک خمیدہ پُشت کو توڑوں کمر کو میں

دل لے چلا مکاں سے مجھے سُوئے لامکاں
مُڑمُڑ کے دیکھتا رہا دیوار و در کو میں

ہوں چار میخ چار عناصر سے میں حسنؔ
کس طرح توڑوں رشتۂ دیوار و در کو میں

مشاعرہ غازیپور بر مکان مسٹر جسٹس کملاکانت ورما
19 جولائی 1941ء

کون سنتا ہے اسے یہ دُور کی آواز ہے

خود مرا ثقلِ سماعت تفرقہ انداز ہے
لحن اقرب کا ترنّم دُور کی آواز ہے

پردۂ سازِ اناالحق پھر نوا پرداز ہے
پردہ دارِ حُسن خود پردہ سرائے راز ہے

سامنے آتے ہیں لیکن کچھ عجب انداز سے
آشنائے راز بھی ناآشنائے راز ہے

سازِ ہستی کو سمجھتا ہوں فریبِ دلفریب
اس کی ہر آواز آوازِ شکستِ ساز ہے

کس طرح منزل بہ منزل جا رہا ہوں بے سکوں
کس قدر اُونچا مقامِ ہمّتِ جانباز ہے

اس کی زد سے دُور ہے دل جب ہوا تیرا ہدف
مجھ کو کیا غم آسماں ہر چند تیر انداز ہے

سُن رہا ہوں لن ترانی ''ربِّ ارنی'' کا جواب
ذرّہ ذرّہ آئینہ دارِ بُتِ طنّاز ہے

جُبہ سائی سے جبینِ شوق ہے قندیلِ عرش
آستانِ حُسن پر یہ عشق کا اعزاز ہے

ہے نمودِ بال و پَر ترکِ تمنّا کے سبب
طائرِ عرش آشیاں پھر مائلِ پرواز ہے

مقتضی لبیک کی ہے ہر صدائے دلنواز
میں رہا ہوں جس جگہ آواز ہی آواز ہے

زندۂ جاوید سے پیدا ہو ربطِ استوار
بس یہی اس چار دن کی زندگی کا راز ہے

گفتگو میں طول گستاخی سمجھتا ہوں مگر
انبساطِ ہمکلامی مانعِ ایجاز ہے

کیا اُٹھانے کو ہے در پردہ کوئی تازہ فساد
کیوں رقیب رُوسیہ[1] پھر آج کل دمساز ہے

موت ہے دارالبقا کی منزلِ اوّل حسؔن
جس کو تم انجام سمجھے ہو وہی آغاز ہے

مسلم اینگلوورنا کیولر اسکول۔آل انڈیا مشاعرہ غازی پور
20دسمبر1941ء

(1) I am pleased to open negotiation for peace and unity with Mr. Jinnah if he wishes" Gandhi Dec. 6th 1941.

بیمار جو اُس کا ہے وہ بیمار نہیں ہے

بیگانۂ اُلفت کو جہاں بار نہیں ہے
اس بزم میں اندیشۂ اغیار نہیں ہے

پندارِ خودی شیوۂ میخوار نہیں ہے
یاں کون ہے جو بیخود سرشار نہیں ہے

ہستی ہے تری پردۂ تصویرِ درِ یار
تو بے خبرِ راز ہے ہشیار نہیں ہے

ہر ذرّے میں ہے تابشِ خورشیدِ جہانتاب
جو دیکھتا ہوں درخورِ اظہار نہیں ہے

انسان کو ودیعت ہوئی ہر چیز پہ قدرت
اس پر بھی وہ مجبور ہے مختار نہیں ہے

سنتا ہوں میں اب مژدۂ لا تحزنو پیہم
میں واں ہوں جہاں کثرتِ افکار نہیں ہے

ہے خام ابھی شاکیٔ بیدادِ محبت
معلوم اسے لذّتِ آزار نہیں ہے

بکتی ہے متاعِ غمِ دل کون خریدے
بازار تو ہے گرمیٔ بازار نہیں ہے

میں بعدِ فنا محرمِ اسرارِ بقا ہوں
یعنی نشۂ بادۂ پندار نہیں ہے

ہے لائقِ تقلید سبک روئی شبنم
دنیائے دَنی محفلِ اغیار نہیں ہے

آزاد ہو گر فکرِ مکاں سے تنِ خاکی
پھر راہ میں حائل کوئی دیوار نہیں ہے

یہ بزمِ طلسمات میں محویتِ پُرکیف
تو خواب میں بیدار ہے بیدار نہیں ہے

ساقی جو دیئے جائے حسنؔ تُو بھی پیے جا
بے خود جو نہ ہو جائے وہ ہشیار نہیں ہے

گورنمنٹ وکٹوریہ ہائی اسکول غازی پور
7 جنوری 1941ء

دیوانہ جو اس کا ہے وہ دیوانہ نہیں ہے

پندارِ خودی شیوۂ فرزانہ نہیں ہے
ہر بے خود و وارفتہ بھی دیوانہ نہیں ہے

اے محتسبو بادہ کشِ روزِ ازل ہوں
محتاجِ پیمانہ و میخانہ نہیں ہے

یوں سجدہ کناں پاؤں پر اس شوخ کے گرنا
کچھ اور ہے یہ لغزشِ مستانہ نہیں ہے

رُودادِ غمِ زیست نہ سُنیے سرِ محشر
اک حشر بپا ہوگا یہ افسانہ نہیں ہے

ہے دل کی سیاہی میں نہاں چشمۂ حیواں
تو خضر رہِ منزلِ جانانہ نہیں ہے

ہے رنج ہے اک مژدۂ جاں بخش مسرّت
ہنسنے کی جگہ ہے یہ عزاخانہ نہیں ہے

حاصل ہے ہمیں شمعِ صفت سوزِ مسلسل
مرغوب تنک ظرفئ پروانہ نہیں ہے

دیوانوں کو سمجھائے جو فرزانوں کی باتیں
دیوانہ ہے دیوانہ وہ فرزانہ نہیں ہے

ہر نقشِ مجازی میں ہے عکسِ رُخِ زیبا
ہر آہ حقیقت ہے یہ بُت خانہ نہیں ہے

بیگانہ ہے تو یار سے اے ناصحِ خودبیں
دیوانہ زخود رفتہ ہے بیگانہ نہیں ہے

زاہد تجھے معراج میّسر ہو تو کیونکر
سب کچھ ہے مگر جرأتِ رندانہ نہیں ہے

ساقی کی عنایت پہ قناعت ہے وگرنہ
میخانہ بہ اندازۂ پیمانہ نہیں ہے

کہنے کو تو نازاں ہے فقیری پہ زمانہ
انداز مگر کوئی فقیرانہ نہیں ہے

میں وادیٔ ایمن کی فضا دیکھ رہا ہوں
اب حسرتِ آرائشِ کاشانہ نہیں ہے

اُمت میں ہوں جب شاہِ فقیراں کی حسنؔ میں
کیا غم ہے اگر شوکتِ شاہانہ نہیں ہے

مشاعرہ برمکان جناب احمد حسن خان صاحب رئیس اعظم غازی پور
3فروری1942ء

ابھی اس راہ سے گزرا ہے شاید کارواں کوئی

نہیں شرمندۂ تاثیر فریاد و فغاں کوئی
کہاں سے لاؤں میں عنوان زیبِ داستاں کوئی

یہ برق و باد و باراں اور یہ بے فکری معاذ اللہ
تمہیں صیّاد کا کھٹکا نہ فکرِ آشیاں کوئی

بڑھے جاتے ہیں سب منزل کی دُھن میں کیا قیامت ہے
پڑا سنتا رہے بانگِ رحیلِ کارواں کوئی

تم ہی کہہ دو کہ ایسے قافلے کا حشر کیا ہوگا
نہ منزل کا تعیّن ہے نہ میرِ کارواں کوئی

تعیش کی ہوس مرنے کا ڈر یہ ضعفِ ایمانی
نہیں پاتا مگر مر کر حیاتِ جاوداں کوئی

وہ پیمانِ وفا پورا کرو مہلت ہے دم بھر کی
تمہیں لایا ہے اس دنیا میں بہرِ امتحاں کوئی

میّسر رخشِ طبعِ اہلِ ہمّت وہ فضائیں ہیں
جہاں فرشِ زمیں ہے اور نہ سقفِ آسماں کوئی

جنونِ عشق نے قیدِ مکاں سے دی یہ آزادی
نظر آتا نہیں میری جبیں کو آستاں کوئی

حجاباتِ نظر اٹھ جائیں بے شک آنِ واحد میں
کلیمی شان سے ہو بھی تو ان کا رازداں کوئی

حصولِ مدعا میں جان بھی جائے تو کیا غم ہے
جو اربابِ ہِمم ہیں ان کو کب فکرِ زیاں کوئی

زمانے کو مساوات و اخوّت تم نے سکھلائی
نہیں لیکن اخوّت کی شرح وردِ زباں کوئی

ستاتے ہو اسے ناحق جسے کمزور پاتے ہو
بنو اک گربۂ مسکیں جو ہو شیرِ ژیاں کوئی

مکینِ قصرِ عالیشان کو یہ کب گوارا ہے
کہ دم لینے کو بیٹھے اس کے زیرِ سائباں کوئی

تمہیں لڑنے کی خود کچھ ایسی عادت ہوتی جاتی ہے
کہ آپس میں نہیں ہوتا کسی پر مہرباں کوئی

یہ آزاد اور شیعہ خاکسار احرار اور مومن
لڑاتا ہے تفنّن کیلئے کٹھ پُتلیاں کوئی

نتیجہ کارِ بد کا کارِ بد ہونا مقرّر ہے
تمہاری نکہت و پستی ہے محتاجِ بیاں کوئی

مری ناکامیاں ہیں تازیانے طبعِ جولاں کی
عمل ہرگز حسؔن ہوتا نہیں یاں رائیگاں کوئی

ایم اے وی اسکول غازی پور آل انڈیا مشاعرہ
12 دسمبر 1942ء

رگ و پے میں سمایا جا رہا ہے
مری ہستی پہ چھایا جا رہا ہے

مری آہ و فغانِ نیم شب کا
اثر کچھ کچھ تو پایا جا رہا ہے

تمنّا شاید اک حرفِ غلط تھی
کہ نقش اس کا مٹایا جا رہا ہے

یہ کہہ دو برق و صرصر سے کہ آئیں
نشیمن پھر بنایا جا رہا ہے

جوابِ آرزو ہے لن ترانی
مگر جلوہ دکھایا جا رہا ہے

فریبِ حُسن کی رعنائیوں میں
جنوں کو آزمایا جا رہا ہے

تلافی کے لئے بزمِ طرب میں
مجھے واپس بلایا جا رہا ہے

میں سب سے دُور ہوتا جا رہا ہوں
کوئی نزدیک آتا جا رہا ہے

مغنّی ہے پسِ آئینۂ دل
مجھے بے خود بنایا جا رہا ہے

بقدرِ ظرف ساقی کی عنایت
جو پیتا ہے پلایا جا رہا ہے

سہارا آپ کا ہے ورنہ کیونکر
یہ بارِ غم اُٹھایا جا رہا ہے

دکھا سکتا ہوں میں اہلِ یقیں کو
مجھے جو کچھ دکھایا جا رہا ہے

نظر پہچانتے ہیں ورنہ پھر کیوں
یہ نظروں کو چُرایا جا رہا ہے

تعالیٰ اللہ یہ دلکش نظارے
وہ رُوٹھے ہیں منایا جا رہا ہے

کوئی دیکھے تو دیکھے یا نہ دیکھے
مگر جلوہ دکھایا جا رہا ہے

جسے سُن کر کبھی باور نہ کرتے
وہ آنکھوں سے دکھایا جا رہا ہے

اسیر اپنا بنا کر دو جہاں کا
اسیری سے چھڑایا جا رہا ہے

فرازِ لامکاں اللہ اکبر
مقامِ دل بتایا جا رہا ہے

وہ قطرہ وجہِ نازِ ابرِ رحمت
جو آنکھوں سے گرایا جا رہا ہے

نظر کا امتحاں مقصود ہوگا
کہ جلووں کو چُھپایا جا رہا ہے

شناور ہو کے بحرِ معصیت کا
حسنؔ دامن بچایا جا رہا ہے

علی گڑھ
4 مئی 1943ء

جس کو حاصل آج تیرے ہاتھ سے اک جام ہے
اُس کا کیا کہنا وہ ساقی! مردِ خوش انجام ہے

موت کی آغوش میں جینا ہے اصلِ زندگی
عافیّت کی زندگی خود موت کا پیغام ہے

زندۂ جاوید ہوتا ہے بشر بعدِ ممات
منزلِ راہِ بقا کا موت عُرفِ عام ہے

اذنِ مے ہے اور میخانے میں نااہلوں کی بھیڑ
جو نہ بہکیں پی کے ساقی اُن کا خالی جام ہے

خندہ پیشانی ہیں زیرِ آسماں عالی ہمم
گردشِ پیہم سے جو گھبرا اٹھے وہ خام ہے

کل تک آتا ہی نہ تھا جن کو کسی پہلو قرار
آج ان کو دیکھیے آرام ہی آرام ہے

ہر غلامی سے بَری ہے اس کا پابندِ وفا
غیرتِ آزادگاں آزادیٔ احشام ہے

کتنی ارزاں ہیں مئے پندار کی سرمستیاں
اک فسونِ دلربا نیرنگِ صبح و شام ہے

آستانِ ناز ہے زیرِ جبینِ بندگی
یہ علوِ جرأتِ رندانہ کا انعام ہے

بے نیازِ التفاتِ یار مُجھ کو کر گئی
ہو نہ ہو اس کی نگاہِ ناز کا یہ کام ہے

انبساطِ سرفرازی ہے مآلِ سوزِ عشق
شمعِ بزمِ یادِ داغِ حسرتِ ناکام ہے

محوِ خوابِ عیش ہے اک عابدِ شب زندہ دار
خود سکونِ دل کے باعث کثرتِ آلام ہے

میرے دامن سے زیادہ آپ کا جلوہ وسیع
کس لئے چاکِ گریباں مُوردِ الزام ہے

پردہ پوشی رازِ دل کی خودبخود یُوں ہوگئی
لوگ کہتے ہیں حسؔن اک رندِ مے آشام ہے

بترغیب واشتعال منشی افتتاح الرحمٰن صاحب نوشتہ شد

علی گڑھ 26مارچ1944ء

آغازِ بہاراں دیکھ چکے انجامِ بہاراں دیکھیں گے

تاچند نگاہِ لطف و کرم رہتی ہے گریزاں دیکھیں گے
کب تک ہے مقدّر میں گردش اے گردشِ دوراں دیکھیں گے

تسکینِ جنوں دُشوار سہی تدبیر سے ہو کیوں مایوسی
گلکاریٔ صحرا خوب ہوئی اب رونقِ زنداں دیکھیں گے

بجلی بھی رہے گلچیں بھی رہے صرصر بھی ہو صیّاد بھی ہو
تب لُطف ہے یہ محبوسِ قفس کا سیرِ بہاراں دیکھیں گے

ہو ساز پہ فطرت کا نغمہ اور وجد میں ہو رنگین فضا
سرشار مئے کیف آور سے ہم رقصِ غزالاں دیکھیں گے

وہ سامنے جب آجاتے ہیں ہوتا ہے دلِ وحشی کو سکوں
پھر اس پہ مچلتے ہیں ضد سے ہم مضطر و حیراں دیکھیں گے

ہے وعظ بھی حُرمت پر مے کی تضحیک بھی ہے میخواروں کی
یوں شیخ کے قول و فعل میں ہم اک فرق نُمایاں دیکھیں گے

یہ رنگِ تغزل چھوڑ حسنؔ مت ذوقِ سخن کو رُسوا کر
اس بحر میں لکھ اک اور غزل مشکل ہے کہ آساں دیکھیں گے

منظور علی فاروقی نے اشتعال دے کر لکھوائی
12 جون ۱۹۴۴ء

(2)

یہ مجمعِ غم میں رقصِ شرر ہے یا گلِ خنداں دیکھیں گے
کیوں بزمِ طرب میں شمعِ صفت ہر رند ہے گریاں دیکھیں گے

ہے عشق سے برتر حُسن مگر ہم حوصلہ کو کیوں پست کریں
جب تابِ نظر پر چشمک ہو پھر کیوں نہ کہیں ہاں دیکھیں گے

آنا ہو تو بے پردہ آئیں آنا جو نہ ہو تو صاف کہیں
ہے تابِ نظر پر ناز ہمیں ہم حُسن کو گریاں دیکھیں گے

ہے دُور بہت منزل دل کی پُرخار ہیں راہیں اُلفت کی
محمل کو مگر ارباب بہم نزدیکِ رگِ جاں دیکھیں گے

چُھپتے ہیں وہ ہم سے آج اگر کل روزِ قیامت کیا ہوگا
ہم حُسنِ تجلّی ریز کو واں اے دل سرِ میداں دیکھیں گے

خود کھونا ہے خود پانا ہے یہ آنکھ مچولی کیا کہنا
لے چل دلِ وحشی دیر نہ کر ہم بھول بھلیّاں دیکھیں گے

ہے لُطف تری بخشش کا فزوں یا داغِ تمنائے عصیاں
تیری ہی عدالت میں ہم کل اے مالکِ میزاں دیکھیں گے

ہے حُسن نظّارہ سوز تو ہو جل جائیں بلا سے ارض و سما
ہیں دید پہ مائل اہلِ نظر اب جلوۂ جاناں دیکھیں گے

ہم چشمِ بصیرت رکھتے ہیں کچھ پردہ دری مقصود نہیں
ہم آپ کا جلوہ دیکھیں گے اور آپ کے شایاں دیکھیں گے

آزاد غمِ کونین ہیں ہم نَے قید نَے قیدِ زماں
صحرا ہو کہ گلشن ہم یکساں فردوس بداماں دیکھیں گے

آزاد علائق ہوجائیں ہر رنج میں راحت ہوگی حسنؔ
پھر فصلِ خزاں میں گلشن کو ہم رنگِ بہاراں دیکھیں گے

منظور علی فاروقی نے از روئے امتحاں اشتعال دے کر فی البدیہہ غزل لکھوائی

12 جون 1944ء

دل ہمارا ہم سے عاجز اور اپنے دل سے ہم
یہ کشا کش تھی کہ لوٹے کوچۂ قاتل سے ہم

انکشافِ رازِ اُلفت چاہتے ہیں دل سے ہم
یوں اُلجھ پڑتے ہیں اکثر مرشدِ کامل سے ہم

نالۂ شبگیر سے برہم تھی بزمِ کائنات
آہ بھی صد حیف کرسکتے ہیں اب مشکل سے ہم

جستجوئے یار کو کچھ اور وسعت دیجیے
یہ سبق پاتے ہیں اپنی سعیٔ لاحاصل سے ہم

اپنی رُسوائی میں مضمر ہے رموزِ بندگی
واپس آنے کے لیے نکلے تری محفل سے ہم

فطرتِ دل بن گئی ہیں کیفیاتِ اضطراب
موج آسا گو بہت نزدیک ہیں ساحل سے ہم

بزمِ عشرت سے اُٹھایا تو نے اپنی کیا ہمیں
ایک دنیا کو اُٹھا لائے تری محفل سے ہم

اس کی جولانگاہ صورت ہم کو معنی کی تلاش
کیوں نہ اُلجھیں ہر قدم پر ناصحِ عاقل سے ہم

منتظر غواص کے تھے تہہ میں دُرہائے خوشاب
جُز خش و خاشاک پاتے کیا لبِ ساحل سے ہم

تیری محفل میں ہمیں ہے خوفِ رُسوائی حسنؔ
ہوش والے ہیں مگر رہتے ہیں کچھ غافل سے ہم

بے محابا کشتیٔ دل نذرِ طوفاں کیجیے
ہیں ہم آغوشِ فنا دل تنگیٔ ساحل سے ہم

عینِ دریا میں حباب آسا ہے جامِ واژ گوں
جی رہے ہیں بے تعلق دامنِ ساحل سے ہم

دیکھ کر نا اہل پر تیری عنایت بے حساب
تشنہ لب اُٹھ کر چلے آئے تری محفل سے ہم

بے خبر تھے رفعتِ تقدیرِ آب و گل سے ہم
حال میں کھوئے رہے غافل تھے مستقبل سے ہم

قافیہ 'منزل' حسنؔ رکھ کر کریں فکرِ سخن
دیکھیے مضمون کیا کیا لائیں اب منزل سے ہم

صاحبِ لولاک ہیں لیکن غنا زیبا نہیں
وضع سے اپنی نظر آتے ہیں اک سائل سے ہم

سخت عاجز آ گئے ہیں اضطرابِ دل سے ہم
بے ارادہ لوٹ آئے آخری منزل سے ہم

تیری منزل سے بہت آگے مقامِ دوست ہے
راہبر واقف ہیں اپنی راہ سے منزل سے ہم

ہے فریبِ عقل و دانش یہ طلسمِ رنگ و بو
اب بہت آگے ہیں اس دشواریٔ منزل سے ہم

اپنی حدِّ وسع تک ہم نے تگ و دو کی مگر
آخری منزل پہ بھی کچھ دور تھے منزل سے ہم

دور ہو منزل اگر تو تیز تر ہو گامِ شوق
کس لیے گھبرائیں آخر دوریٔ منزل سے ہم

اضطرابِ دید ہر ہر گام پر ہو تیز تر
پائیں ذوقِ جذبِ کامل دوریٔ منزل سے ہم

سجدہ ریزی میں بھی شانِ بے نیازی جلوہ گر
کس قدر آزاد ہیں رسم و رہِ منزل سے ہم

کر رہے ہیں راہِ صد سالہ کو اب طے ہر نفس
پہلے خائف تھے بہت اس دوریٔ منزل سے ہم

یہ جنوں کو شی سمجھئے یا مسلسل اضطراب
دور ہوتے جارہے ہیں اور بھی منزل سے ہم

تھا وہ پیمانِ ازل تمہید معراجِ کمال
واقفِ اسرارِ دل تھے پہلی ہی منزل سے ہم

اب یہ سمجھے عمر بھر مشقِ جنوں کرنے کے بعد
لوٹنا تھا پھر وہیں بھٹکے تھے جس منزل سے ہم

اتصالِ موج و ساحل انتشار انگیز ہے
مطمئن ہوں خضر کیا قطعِ رہِ منزل سے ہم

وہ جدھر لے جا رہا ہے جارہے ہیں ہم حسنؔ
مصلحت کب پوچھتے ہیں رہبرِ منزل سے ہم

بترغیب واشتعال منشی افتتاح الرحمٰن صاحب علی گڑھ
28جولائی1944

جُنبش میں ہے پھر پردۂ در دیکھ رہے ہیں
پھر اپنی تمنّا کا اثر دیکھ رہے ہیں

بڑھتی ہوئی پھر شورشِ سر دیکھ رہے ہیں
پھر خواب میں اجڑا ہُوا گھر دیکھ رہے ہیں

ہے خیرگیٔ چشمِ تمنّا کا یہ عالم
کچھ دیکھ نہیں سکتے مگر دیکھ رہے ہیں

چُھپ چُھپ کے دکھاتے ہیں جمالِ رُخِ زیبا
وہ حوصلۂ قلب و نظر دیکھ رہے ہیں

جو شے ہے وہ اک پردۂ تصویر ہے گویا
اک عکسِ تمنّا ہے جدھر دیکھ رہے ہیں

اب ہوش کی دُنیا میں انہیں بھی نہیں پاتے
تکمیلِ جنوں کا یہ اثر دیکھ رہے ہیں

مستُور ہے وہ چشمِ تصوّر سے بظاہر
بے پردہ مگر اہلِ نظر دیکھ رہے ہیں

خودبینی کی معراج سمجھیئے کہ ہر اک شے
آئینہ ہے اک پیشِ نظر دیکھ رہے ہیں

معکوس ہے ہر نقش دمِ مشقِ نظارّہ
ہم معرکۂ قلب و نظر دیکھ رہے ہیں

ہونے کو ہے کیا ختم یہ معیادِ اسیری
دیوار میں اب روزن و در دیکھ رہے ہیں

کچھ مجھ میں کمی ہے جو نہاں آپ ہیں ورنہ
پردہ ہے کہاں آپ اگر دیکھ رہے ہیں

سجدوں کے اثر سے ہے جبیں ایسی منوّر
حسرت سے مجھے شمس و قمر دیکھ رہے ہیں

ہاں حُسن طلب حوصلہ افزا ہو فُغاں اور
کس شوق سے وہ زخمِ جگر دیکھ رہے ہیں

یُوں دیکھنے والے تو ہزاروں ہی ہیں لیکن
ہم ان کو بہ اندازِ دِگر دیکھ رہے ہیں

بن جائے نہ گردوں کفِ سیلاب یہ ڈر ہے
مائل بہ فُغاں دیدۂ تر دیکھ رہے ہیں

ماحول موافق ہے نہ فرصت ہے نہ وہ ذوق
ہم ترکِ سخن ہی میں مفر دیکھ رہے ہیں

روشن ہے معارف کی فسوں کاریٔ تحریر
رنگینیٔ اوراقِ شجر دیکھ رہے ہیں

ہر شعر حسنؔ کا ہے سِرا پردۂ عرفاں
ہم سب سے بُلند اُس کی نظر دیکھ رہے ہیں

علی گڑھ
7 جولائی 1945ء

اعدا کو بہم شیر و شکر دیکھ رہے ہیں
کیا رنگ دکھائے یہ خبر دیکھ رہے ہیں

محفل میں اِدھر گاہ اُدھر دیکھ رہے ہیں
افسونِ سیاست کا اثر دیکھ رہے ہیں

فی الفور اُدھر ہوش سے بیگانہ ہے ذی ہوش
دُزدیدہ نظر سے وہ جدھر دیکھ رہے ہیں

ہم آپ کی اس چشمِ فسوں گر کے تصدق
دُنیائے خرد زیر و زبر دیکھ رہے ہیں

کس طرح مٹادیں یہ نشاں امن و سکوں کا
یہ اہلِ ہُنر بندۂ زر دیکھ رہے ہیں

سب شوق میں منزل کے بڑھے جاتے ہیں اور ہم
بیٹھے ہیں سرِ راہگزر دیکھ رہے ہیں

مایوسِ تمنّا ہیں بہار آئے نہ آئے
اس نخل کو بے برگ و ثمر دیکھ رہے ہیں

معدوم ہوئی دہر میں یوں رسم و رہِ خیر
اپنوں کو بھی آمادۂ شر دیکھ رہے ہیں

خود اپنے ہُنر عیب نظر آتے ہیں ہم کو
اور عیب کو اوروں کے ہُنر دیکھ رہے ہیں

وہ خضرؔ ہو یا آصفؔ و محمودؔ و ہمایوںؔ
ہر نام کا معکوس اثر دیکھ رہے ہیں

وہ پنتؔ ہوں گاندھیؔ ہوں رجندرؔ ہوں کہ نہروؔ
آزادئ مسلم میں خطر دیکھ رہے ہیں

سپروؔ ہوں کہ راجاؔ ہوں دسائیؔ کہ سورکارؔ
ہر ایک کو آمادۂ شر دیکھ رہے ہیں

صد حیف ہے لیکن کہ حسنؔ احمدؔ و آزادؔ
ان بردہ فروشوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

قُرآن سے برگشتہ ہے قُرآن کا حامل
یہ شومیٔ فرخندہ سِیَر دیکھ رہے ہیں

اشرافِ سیاست ہیں بہم دست و گریباں
کس طرح ہو یہ معرکہ سَر دیکھ رہے ہیں

دریائے سیاست کے شَناور نہیں عالم
دُشمن کے سہارے میں مفر دیکھ رہے ہیں

اعدا کے مقاصد میں ہے اعدا سے تعاون
پھر ضد کہ ہم اس میں ہی مفر دیکھ رہے ہیں

اک جا حق و باطل ہوں یہ ممکن ہی نہیں ہے
اَحول ہے مگر جن کی نظر دیکھ رہے ہیں

بیگانۂ ملّت ہیں وطن کے لئے جیتے
ہم اُن کے لئے نارِ سَقر دیکھ رہے ہیں

ہر صُلح کی تحریک میں پنہاں ہے شرارت
ہم دامنِ ملّت میں شرر دیکھ رہے ہیں

ہر قید سے آزاد ہیں اللہ کے بندے
ہر جگہ وہ اپنے لئے گھر دیکھ رہے ہیں

ہے موت و حیات اپنی زمانے سے علیحدہ
کوئی ہو شریک اس میں ضرر دیکھ رہے ہیں

صدیقی و فاروقی و عثمان و شیعہ
کب ہوں یہ بہم شیر و شکر دیکھ رہے ہیں

یہ یونینسٹ اور یہ احرار، یہ مومن
ہم اس کی بِنا فتنہ و شر دیکھ رہے ہیں

وابستہ جماعت سے ہے افراد کی عزّت
تقسیم میں ملّت کو ضرر دیکھ رہے ہیں

توفیق دے ان قوم فروشوں کو الٰہی
دل پھیر کے تجھ سے یہ کدھر دیکھ رہے ہیں

یہ قوّتِ تنظیم سے واقف ہی نہیں ہیں
غدار ہیں یہ کینۂ زر دیکھ رہے ہیں

آماجگہہِ ناوکِ اغیار ہیں لیکن
کُچھ ہم کو نہیں اِس سے حذر دیکھ رہے ہیں

لہرائیں سرِعالمِ لاہوت جو پرچم
طاغوت کو افگندہ سِپرَ دیکھ رہے ہیں

حاصل ہے جنہیں شاہی اقلیم توکل
پامالِ فنا لعل و گہر دیکھ رہے ہیں

اللہ سے نصرت کے جو طالب ہیں وہ بندے
نزدیک بہت فتح و ظفر دیکھ رہے ہیں

اغیار سے وابستہ جو کرتے ہیں اُمیدیں
آوارہ انہیں خاک بہ سر دیکھ رہے ہیں

خم پیشِ خدا فرقِ اطاعت ہو تو ان کا
ہم کنگرۂ عرش پہ سر دیکھ رہے ہیں

یہ گردشِ ایّام سمجھ میں نہیں آتی
نیرنگی ہر شام و سَحر دیکھ رہے ہیں

مل جائے کوئی خضر رہِ رُشد و ہدایت
ہر آن ہے ہنگامِ سحر دیکھ رہے ہیں

اُڑ جائیں قفس لے کے نہ گلشن سے یہ صیّاد
مُرغانِ قفس قوّتِ پَر دیکھ رہے ہیں

تم اپنی بقا چاہو تو ہو جاؤ منظّم
ہر گام پہ ہم ورنہ خطر دیکھ رہے ہیں

مُضمر ہے حسنؔ راز تباہی کا اسی میں
شمشیر سے بیزار کمر دیکھ رہے ہیں

مزید اشتعال دلانے پر۔علی گڑھ
7جولائی1945ء

نو گرفتار پھڑکتا ہے تہہِ دام ابھی

میکشو پیرِ مُغاں خود ہے تہی جام ابھی
بند شیشے میں رہے گی مئے گُلفام ابھی

ہم نے لبیک کہا بڑھ کے تری دعوت پر
کنزِ مخفی میں تھا پوشیدہ ترا نام ابھی

بے رُخی کس لئے یہ بادہ کشوں سے ساقی
دیکھ شیشے میں ہے وہ دُردِ تہہ جام ابھی

کیا خطا میری تھی کیوں آپ نے آزاد کیا
ہے یہ حسرت کہ رہوں بندۂ بے دام ابھی

منزلِ عشق بہت دُور نظر آتی ہے
عقل کے پیشِ نظر جیف ہے انجام ابھی

چشم و ابرو کے اشارے جو سرِ بزم نہ ہوں
ٹوٹ جائے یہ طلسمِ سحر و شام ابھی

عکس آئینے میں ہم شکل نظر آتا ہے
جذبۂ حُسنِ عقیدت ہے مگر خام ابھی

میرا یہ ذوقِ گنہ باعثِ صد رحمت ہے
ورنہ آئے مری تخلیق پہ اِلزام ابھی

پھیر کر منہ کو جھڑکنا سرِ بزمِ دشمن
ہم کو بُھولی نہیں وہ لذّتِ دُشنام ابھی

اُس کے وعدے پہ یقیں ہے مجھے کامل اے دل
ٹھہر، آجائے گا' آجائے گا آرام ابھی

رُوشناسِ مئے عرفاں ہے مِرا دل لیکن
اُس کو بھاتی ہے پرستاریٔ اصنام ابھی

آپ کے وعدۂ فیضانِ تجلّی کے نثار
دیکھیں کس طور سے ہو نُور کا اِتمام ابھی

فطرتِ شوخ مری رازِ حیاتِ دل ہے
تم سمجھتے ہو کہ ہوں خوگرِ اوہام ابھی

زُہد و تقویٰ کا تجھے اجر ملے گا زاہد
دُور لیکن ہے بہت منزلِ اِنعام ابھی

میری دُنیا میں نہیں کشمکشِ ہجر و وصال
ہے تمنائے دلی، حسرتِ بے نام ابھی

میں نے عصیاں کو ترے رحم و کرم پر چھوڑا
فطرتِ جُرم کو ہے حسرتِ ناکام ابھی

میں نہ دیوانوں میں ہوں اور نہ فرزانوں میں
رنج دیتی ہے مجھے کثرتِ آلام ابھی

کیا تعجب ہے پھر اک بار نوازیں ہم کو
پھر پلٹ آئے وہیں گردشِ ایام ابھی

آنکھ والے نہیں معراج کسے حاصل ہو
اُن کے جلوے تو پریشاں ہیں لبِ بام ابھی

کُلفتِ زیست سے گو موت نے آزاد کیا
منزلِ عیشِ ابد اور ہے دو گام ابھی

دیکھیے دیتے ہیں کب اذنِ ملاقات ہمیں
ان سے جاری ہے حسنؔ نامہ و پیغام ابھی

غزل برائے مشاعرہ اٹاوہ، علی گڑھ
18 فروری 1946ء

تیرے دیوانے کفن چاک و بَرہنہ سر اُٹھے
حشر میں اُٹھنا مقدّر تھا بہ کرّ وفر اُٹھے

تیری مرضی تھی اُٹھے محفل سے ہم تیری مگر
اُٹھتے اُٹھتے کائناتِ دہر کو لے کر اُٹھے

واعظا کیا بے محل یہ گفتگو ہے کس لئے
میکدے میں آکے ناحق بحثِ خیر و شر اُٹھے

بزم تھی ساری مُکدّر اور وہ خاموش تھے
اپنی گنجایش نہ پاکر ہم دُعا دے کر اُٹھے

اب تو دم آنکھوں میں ہے باقی نہیں ہے کس طرح
ناتواں سے لذتِ نظارۂ ساغر اُٹھے

ضوفشاں ہوں داغ ہائے دل اگر
اعتبارِ حُسنِ خورشید و مہہ و اختر اُٹھے

سجدہ ریزی میں ہے مُضمر رازِ تکمیلِ جنوں
جو علوئے تربیّت چاہے وہ یاں گر کر اُٹھے

جُبہ سائی ہے علوئے طالعِ بیدارِ شوق
آستانِ یار پر سر کس طرح جھک کر اُٹھے

تنگ دامانی کے باعث خیرگی طاری ہوئی
ورنہ اُٹھنے کو حجاباتِ نظر اکثر اُٹھے

عُمر بھر یہ مُضطرب تھا اک ذرا نیند آگئی
آپ کی مرضی یہی ہے تو بہت بہتر اُٹھے

مجھ پہ حد قائم جو کرنی ہو کریں اس کے لئے
کیا ضرورت ہے کہ اک ہنگامۂ محشر اُٹھے

انتظارِ دید میں پتھرا گئیں آنکھیں حسنؔ
دیکھئے کب تک نقابِ چہرۂ انور اُٹھے

آل انڈیا مشاعرہ بدایوں، علی گڑھ
12 جولائی 1946ء

شمعِ انوارِ ہدایت کو بُجھانے کے لئے
باغیانِ دین اور کُفار کچھ خودسر اُٹھے

اپنوں سے شکوہ ہے ہم کو ورنہ کچھ پروا نہیں
دیول و نہرو مُکرجی ہوں کہ ساور کر اُٹھے

یُوں نشے میں چُور ہے مخمور پندارِ حیات
نیند کا ماتا کوئی جیسے ابھی سو کر اُٹھے

ظلمتِ تکفیر جب چھائی فضائے دہر پر
مَشعلِ نُورِ ہدایت لے کے پیغمبر اُٹھے

کیا عجب ہے غیرتِ قہار آئے جوش میں
ان کی سرکوبی کو اک فاروقؓ یا حیدرؓ اُٹھے

ہے یہ اک قانونِ فطرت پھر سے پیدا ہو خلیل
شمعِ وحدت کے بُجھانے کو اگر آزر اُٹھے

خوابِ غفلت تا کُجا کب نیند ہے پیغامِ موت
زندگی چاہے تو مسلم چھوڑ کر بستر اُٹھے

وقت آیا ہے کہ اب اپنے تحفظ کے لئے
بَچّہ بَچّہ ہاتھ میں تیغ و سپر لے کر اُٹھے

ہر کہہ و مہہ کاش ہو اس طرح سرگرمِ سعی
جُستجو میں امتیازِ رہروِ رہبر اُٹھے

راحتِ سیلِ حوادث منزلِ اہلِ ہِمم
بے محابا بحرِ طُوفاں خیز میں لنگر اُٹھے

حدِّ امکانِ مسلماں سرحدِ ملکِ قدم
اس کی خاطر پردہ ہائے گُنبدِ بے در اُٹھے

معجزہ دیکھا زمانے نے رموزِ عشق کا
آگ لگنی تھی کہ شعلے ہر طرف گھر گھر اُٹھے

آج بھی ضامن وہی ہے سبز گنبد کا مکیں
واسطے جس کے حجابِ گُنبدِ بے در اُٹھے

پست کیوں کرتی ہیں تجھ کو بے سروسامانیاں
حشر برپا ہو اگر تیری نظر اُوپر اُٹھے

ہو اشارے پر ترے پھر گردشِ لیل و نہار
ہاں مگر اسلام کا تُو پھر علَم لے کر اُٹھے

رفعتیں پابوس ہونے کو حسنؔ بے چین ہیں
اب ضرورت ہے کہ تو نامِ خدا لے کر اُٹھے

علی گڑھ
13 جولائی 1946ء

کیا ہم تحمّلِ غمِ ہجراں نہ کرسکے
ہاں انتظارِ وعدۂ جاناں نہ کرسکے

تجھ کو تصوّرات میں عُریاں نہ کرسکے
ظلمت کدے میں اپنے چراغاں نہ کرسکے

نشترزنی سے اور بڑھی شورشِ جنوں
کانٹے رفوئے جیب و گریباں نہ کرسکے

نااہل فیضِ صحبتِ رنداں کے باوجود
دل کو حریف بادۂ عرفاں نہ کرسکے

اپنی بساط کیا تھا ادا بندگی کا حق
ہم نے کیا مگر ترے شایاں نہ کرسکے

اپنے تصوّرات نہ اپنے تخیّلات
مجھ کو توہمات پریشاں نہ کرسکے

تھی باغباں کی لغزشِ ہر گام پر نظر
گلشن میں رہ کے سیرِ گلستاں نہ کرسکے

بے دست و پا ہیں تیرے بغیر آج ورنہ ہم
مُشکل وہ کون تھی جسے آساں نہ کرسکے

یہ دلفریب اس کے لئے ہوں گے سبز باغ
ہم رنگِ گلستاں جو بیاباں نہ کرسکے

اس کی نگاہِ شوق کے قربان جایئے
ہم اعتذارِ تنگیٔ داماں نہ کرسکے

ہم اس مقام پر ہیں کہ دُنیا کے شعبدے
بھائے مگر کبھی ہمیں حیراں نہ کرسکے

کمزوریٔ نگاہِ تمنّا تو دیکھئے
محسوس ان کو نزدِ رگِ جاں نہ کرسکے

ہے اعتبارِ شمس و قمر اختر و گُہر
ہم داغہائے سینہ نمایاں نہ کرسکے

ہم نقشِ پا بہ ریگ سہی پھر وہ نقش ہیں
جس کو خراب گردشِ دوراں نہ کرسکے

مقسوم ہے وہ عُمر اگر میرے واسطے
جس کو قیاس عمرِ گُریزاں نہ کرسکے

ہم زندگی کے واسطے مر جائیں گے حسنؔ
جب کوئی اور زیست کا ساماں نہ کرسکے

مشاعرہ بر مکاں منشی افتتاح الرحمٰن آرزو صاحب
علی گڑھ، 30 اگست 1946ء

مردِ مجاہد

یہ نظم غازی پور کے ایک جلسے میں پڑھی گئی جس پر حاضرین نے انہیں ''مجاہد ملّت'' کے خطاب سے نوازا۔
بعدازاں یہ نظم مثنوی خدمتِ ماموره میں شائع ہوئی جسے ہندوستانی پریس غازی پور نے 1942ء میں چھاپا۔

☆......☆......☆

تکبیر کا پیغام سُناتا ہے مجاہد سوتی ہوئی بستی کو جگاتا ہے مجاہد
اک شور ہے آتا ہے وہ آتا ہے مجاہد شمشیرِ برہنہ کو اُٹھاتا ہے مجاہد
کہہ دیجیے مقصود اسے جنگ نہیں ہے
یہ جنگ کا اعلان پۓ جنگ نہیں ہے

ارزاں ہے بہت بادۂ پندار کی ہستی پنہاں ہے تکبّر کی بُلندیوں میں پستی
پھر مُوردِ صد جور ہے کمزور کی ہستی مفقود زمانے سے ہوئی صُلح پرستی
پھر سر سے کفن باندھ کے آتا ہے مجاہد
اللہ کے غُصّے سے ڈراتا ہے مجاہد

یہ مردِ مجاہد ہے رضاکار سپاہی ہر حال میں ہے تابعِ فرمانِ الٰہی
ہر ضرب ہے اللہ کی قدرت پہ گواہی اک خاک نشیں عبد کی اللہ رے شاہی
کمزور کا والی ہے یہ مظلوم کا حامی
یکساں ہے اسے ہندی و افغانی و شامی

فطرت میں نہ شر ہے نہ فساد اور نہ کینہ گنجینۂ اُلفت ہے مسلمان کا سینہ
بہتا ہے لہو وقتِ دُعا ہو کے پسینہ رہتا ہے رواں بادِ مخالف میں سفینہ
یہ امن سے رہتا ہے تو مامون ہے دنیا
یہ واقفِ اسرار ہے مجنون ہے دنیا

میدانِ وفا میں ہے یہ اک مردِ مجاہد ایوانِ سیاست میں مدّبر ہے یہ قاصد
اور صومع میں دیکھیے تو زاہد و عابد گُم کردہ رہوں کیلئے اللہ کا قاصد
شاگرد خدا کا ہے یہ قرآن کا عالم
پُوچھے کوئی قرآن سے خود اس کے مَکارم

کفّار کے ظلموں کو یہ سہتا ہے ہمیشہ دھارے پہ زمانے کے یہ بہتا ہے ہمیشہ
حق بات جو ہوتی ہے وہ کہتا ہے ہمیشہ ایثار پہ تیار بھی رہتا ہے ہمیشہ
اللہ کے دشمن سے یہ رکھتا ہے عداوت
ہر نعرۂ تکبیر میں ہے صُلح کی دعوت

باطن بھی وہی اس کا ہے جو اس کا ہے ظاہر لے کاش سیاست میں سبق اس سے مدبّر
مامورِ زمانہ ہے یہ سردار ہے آمر احکامِ خدا پر بھی کمربستہ ہے حاضر
یہ حق کی اشاعت کے لئے آگ میں گودے
دریاؤں کو پھاندے یہ پہاڑوں کو بھی کاٹے

حق بات پہ شیدا ہے یہ اللہ کا بندہ ایمان و عمل صبر و رضا اس کا ہے شیوہ
مقصود ہے اسلام کی عظمت کو بڑھانا قلّت کا اسے غم ہے نہ کثرت کی ہے پروا
نُصرت ہے نہ سامان نہ تعداد پہ مبنی
نُصرت ہے بس اللہ کی امداد پہ مبنی

لڑنے میں یہ سبقت کو گوارا نہیں کرتا اللہ سے ڈرتا ہے کسی سے نہیں ڈرتا
مرنے کے ارادے سے ہے جانباز سنورتا جیتا ہے بہرحال یہ ہرگز نہیں مرتا
اس کے لئے ہر تیرِ عدو آبِ بقا ہے
اعدا کے لئے گھاس کے تنکے میں قضا ہے

اسلام کی شوکت پہ کوئی حرف نہ آئے جاتی ہے مجاہد کی اگر جان تو جائے
جس دشت میں یہ نعرۂ تکبیر لگائے گلکاریٔ خوں گلشنِ فردوس بنائے
کہتا ہُوا تکبیر یہ دُنیا سے سدھارے
دیکھے ہیں زمانے نے بہت ایسے نظارے

باطل کے مقابل ہے یہ حق کوش نمازی ہے جنگ میں بھی پیشِ نظر صُلح نوازی
لاکھوں سے لگاتا ہے یہ اک جان کی بازی مرتا ہے شہید اور جو جیتا ہے تو غازی
ہوتا ہے کبھی پیشِ نظر بدر کا نقشہ
منظر کبھی آتا ہے نظر کرب و بلا کا

اللہ مجاہد کو ہر آفت سے بچائے اور اس کو نظر چرخ کی بد لگنے نہ پائے
اک اس کے لئے اس نے بہت ظلم اُٹھائے وہ چاہے تو جانباز کی ہمّت کو بڑھائے
قرآن میں وعدہ یہ حسؔن صاف لکھا ہے
مظلوم کے حامی کا نگہبان خدا ہے

نیاز نامۂ مدحیہ بجناب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دام اقبالہ،

1945

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب

1945

بیادگارِ سدیدِ افتتاح میڈیکل کالج

1364ھ

از ہمتِ والانہمت حسن عبداللہ حسنؔ

1364ھ

1945ء مطابق 1364ھ

کبھی ہم حاملِ اخلاق و اوصافِ پیمبر تھے
بہرعنوان ہر ذی روح سے افضل تھے برتر تھے

زمانہ پھر وہ آیا زینتِ اورنگِ شاہی تھے
مہیّا گرد اپنے جملہ سامانِ تباہی تھے

بالآخر نکبت و ادبار و پستی نے ہمیں گھیرا
مگر تھا نشۂ پندار کا ہم پر اثر گہرا

کُھلیں آنکھیں تو اک ہنگامۂ محشر بپا پایا
نظر آتا نہ تھا ہمدرد کوئی بھی مسلماں کا

جو کچھ اسلاف نے پیدا کیا اخلاف کھو بیٹھے
پھر آیا دل تو خود اپنی زبوں حالی پہ رو بیٹھے

تعیّش اور بیکاری نے کھویا سب وقار ان کا
ستم یہ تھا کہ بے دینی نے کھویا اعتبار ان کا

فنا کی آخری منزل پہ تھی ان کی زبوں حالی
فضائے دہر پر چاروں طرف چھائی تھی مایوسی

مگر سیّدؔ نے اور ان کے رفیقوں نے بصد مشکل
سہارا دے کے کچھ دن اور رہنے کے کیا قابل

ہوئی تجویز کالج اک علی گڑھ میں بنا پائے
علومِ حاضرہ سے رُوشناس ان کو کیا جائے

یہ نُسخہ زُود اثر تھا قوم کی حالت ذرا سنبھلی
زمانے نے مگر پھر جلد ہی اک اور کروٹ لی

خود اپنے گھر میں دشمن ہوگئے بنتے تھے جو بھائی
بہارِ گلشنِ اسلام انہیں مطلق نہیں بھائی

حکومت نے بھی ان سے ساز کرنا مصلحت جانا
کچھ اپنوں نے بھی حیف ان کا فریبِ دوستی کھایا

خدا رکھے جناحِ دیدہ ور نے دستگیری کی
حریفوں سے سیاسی دوڑ میں وہ لے گیا بازی

اگر تائیدِ ربانی ہمارے ساتھ ہے شامل
تو پاکستان بھی ہوگا ہمیں اب جلد ہی حاصل

مگر آزاد رہنے کے لئے تیار ہونا تھا
منظّم ہو کے ہم کو آہنی دیوار ہونا تھا

نہ اپنے پاس دولت تھی نہ حکمت تھی نہ حرفت تھی
بس اب لے دے کے باقی نام کی دیرینہ عظمت تھی

بہت پیچھے تھے ہم اقوامِ عالم سے تمدن میں
نظر انداز ہوجاتے تھے قدروں کے تعین میں

ضرورت تھی کہ حالتِ اقتصادی بھی سدھر جائے
کہ یہ قوم اپنے ہم چشموں میں عزّت کی جگہ پائے

ضرورت ایسے پُوری ہورہی ہے آپ کے ہاتھوں
فلاحِ دین و دُنیا پارہے ہیں آپ کے داموں

علومِ دینیہ، آئینِ جنگ و طبِ یونانی
زراعت، فنِ تعمیرات، حرفت اور ہوا بازی

غرض تعلیم کا ہر شعبہ مرہونِ عنایت ہے
وہی سیّد کا کالج ہے مگر اب کتنی وسعت ہے

تعالی اللہ یوں اب قوم کی حالت بدل ڈالی
نصیبوں میں نظر آتی ہے اب مفلس کے خوشحالی

یہ محنت اور یہ سن اور یہ حُسّاد کے طعنے
موانع ہیں مگر بڑھتا ہے پھر بھی ہر قدم آگے

زمانے کی یہ پُرآشوب حالت اور یہ ہمّت
دُعا دل سے نکلتی ہے خدا کی آپ پر رحمت

بنائے میڈیکل کالج اہم سے بھی اہم تر ہے
مگر اس کامیابی کا بھی سہرا آپ کے سر ہے

بجائے خود یہ خدمت خلق کی اتنی بڑی ہوگی
حسؔن یہ بالیقیں وجہہ نجاتِ اُخروی ہوگی

الٰہیٰ اس کو پھلتا پُھولتا دیکھیں ضیاء الدیں
صلہ یوں کاوشوں کا اپنی پا جائیں ضیاء الدیں

مجھے بھی فکرِ سالِ کامرانی، سخت مشکل تھی
ندائے ہاتفِ غیبی پئے تاریخ یہ آئی

ضیاء الدین احمد محسنِ آفاق ہیں ہجری
1364ھ
مسیحی ہے مکرم بخت بادا سیّدِ ثانی
1945

بہ حضور قائدِ اعظم محمد علی جناح

اے جناحِ دیدہ ور تجھ پر خدا کی رحمتیں
قوم کی خاطر اٹھائیں تو نے کتنی زحمتیں

تیرا علم و فضل اور تیرا تدبّر بے مثال
ہر نمط ناقابلِ تردید ہے تیرا کمال

تجھ کو ہر راحت میسّر تھی ہر اک آرام تھا
ہاں مگر اک جذبۂ اسلام تھا جو خام تھا

بے خبر تھا علمِ دیں سے عظمتِ اسلام سے
دُور کی نسبت رہی تجھ کو خدا کے نام سے

ایک مدّت تک رہا بیگانۂ رُوحانیت
ماڈیت سے رہی مملو سراسر ذہنیت

تھا مگر سینے میں تیرے ایک قلبِ ناصبور
اور تمیزِ نیک و بد کا تجھ کو حاصل تھا شعور

اک تڑپ رکھتا تھا تُو اور تیرے دلمیں جوش تھا
بادۂ سر جوشِ حُریّت سے تو مدہوش تھا

تیری سچائی دلیری اور دیانت آشکار
تھا یگانوں اور بیگانوں کو تیرا اعتبار

جب سوالِ قسمتِ ہندوستاں پیدا ہُوا
تو شریکِ گفتگو تھا اور بہ چشم و گوش تھا

تُو نے سمجھا خوب انگریز اور ہندو کا مزاج
تجھ کو یہ احساس تھا خطرے میں ہے مسلم کی لاج

تو ہی اک آگے بڑھا قرطاسِ نہرو کے خلاف
رکھدیئے چودہ نکات آئینِ ہندو کے خلاف

ہوگئی کایا پلٹ دُنیا میں ہلچل پڑ گئی
کُھل گئی ابلہ فریبی کانگریس کے عزم کی

تیرا اک ہمنام جو مخلص بھی تھا ذی ہوش بھی
چیر کر نکلا وہ صف کو باوقار و آگہی

کانگریس اپنا وقار اپنا اثر کھونے لگی
جو غلط فہمی تھی مُسلم کو رفع ہونے لگی

دوست اور دشمن کی پیدا ہوگئی ہم کو تمیز
ملک سے بڑھ کر ہوئی آزادیٔ ملّت عزیز

کاش وہ مردِ مجاد آج ہوتا تیرے ساتھ
تیری ہر جدّوجُہد میں وہ بٹاتا تیرا ہاتھ

یہ مشیّت میں نہ تھا صد حیف لیکن اے جناحؔ
تھی تری قسمت میں تنہا سعیٔ بہبود و فلاح

وہ محمدؐ اور علیؑ پر جان و دل سے تھا نثار
ملّتِ اسلامیہ کی خدمت اس کا تھا شعار

دفن ہے بیت المقدس میں وہ جنّت کا مکیں
سونپ کر تجھ کو متاعِ نازِ ختمِ مُرسلین

امّتِ مرحوم کی کشتی کا ہے تو ناخدا
زیب دیتا ہے لقب اب تجھ کو ظلِ اللہ کا

قوم نے پایا ہے تجھ سے جوش و استقلال و عزم
تازہ ہوتے جا رہے ہیں اس کو سب آئینِ رزم

منتشر اجزائے ملّت منسلک ہونے لگے
کشتِ دل میں تُخم یکجہتی کا سب بونے لگے

کُھل گئیں آنکھیں حقیقت اب نظر آنے لگی
مضمحل اعدا ہوئے آواز بھرّانے لگی

اپنی ناکامی سے ہندو ایسے کھسیانے ہوئے
غصّے میں جلتے ہیں اپنے آپ دیوانے ہوئے

اب اتر آئے ہیں گالی اور دھمکی پر ہنود
یہ گوارا کب کہ زائل ہو مسلماں کا وجود

پنت و گاندھی نہرو و راجا مکرجی مالوی
اور آزاد و حسین احمد ہمایوں لال جی

یعنی جو ہمدردئ اسلام کا بھرتے تھے دم
بے نقاب آئے ہیں وہ اب ٹھونک کر میداں میں خم

کُھل گیا انگریز سے ان کو نہ تھا کچھ اختلاف
ان کی ساری جنگ تھی بس قومِ مسلم کے خلاف

یہ تری بیدار مغزی اور تدبّر کی ہے حد
ہوگئی بیکار اعدا کی ہر اک جدّ وجُہد

تفرقے مٹنے لگے بیدار مسلم ہوگئے
جینے مرنے کے لئے تیار مسلم ہوگئے

تو نے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا قوم کو
راز پھر خود اعتمادی کا بتایا قوم کو

قوم نے تیری قیادت میں سیاست سیکھ لی
اب سمجھتی ہے بخوبی فرقِ موت و زندگی

تُو نے باعزّت اسے اک قوم اب منوا لیا
اتنے اعدا ایک تُو ہاں تیرا حامی ہے خدا

تُو نے یہ انعام پایا خدمتِ اسلام کا
رُوشناس اسلام سے ہونے پہ تو مجبور تھا

قوم یہ کنگال تھی جُز دین کیا دیتی تجھے
دین اس کے پاس تھا تجھ سے ملی دُنیا اسے

تیرے بازو میں ہے طاقت نُورِ ایماں کی جناحؔ
کارنامہ ہے ترا جمعیتِ ملّی جناحؔ

تُو نے ہر بدخواہِ ملّت کو دیا پیغامِ جنگ
تیری ہمّت پر ہیں یکساں دوست بھی دشمن بھی دنگ

عالمانِ دیں کو جو کرنا تھا تُو نے کردیا
یہ سعادت تجھ کو بخشی ہے خدا نے مرحبا

ملتِ اسلام کی شیرازہ بندی تو نے کی
رائیگاں کردی سراسر تُو نے اعدا کی سعی

واردھا ۔ استھانِ نہرو لندن و واشنگٹن
ہر جگہ چرچا یہی ہے رات دن اب اے حسنؔ

قومِ مسلم کو فنا کردیں یہ اب آساں نہیں
چارہ دینے کے سوا اب ان کو پاکستاں نہیں

کانگریس کو کب ہے مسلم کی قیادت کا شعور
کُھل پڑے اعدا غلط فہمی ہوئی مسلم کی دُور

ان کو احساسِ شکستِ فاش اب ہونے لگا
گالیوں پر اب اتر آئے ہیں اعدا بے حیا

شاد باش و شاد زی اے قائدِ اسلامیاں
تیرے ہاتھوں میں ہے آزادیٔ مسلم کا نشاں

رہبری کی تجھ کو طاقت دے اللہ العالمین
تجھ کو حاصل ہو سدا فیضانِ ختم المرسلین

نسبتیں تجھ کو محمدؐ سے علیؓ سے رابطے
تیرے بازو ہوں جناحؒ خالدِ شہ زور سے

تیرے ہاتھوں ملّتِ اسلام کی تنظیم ہو
تیری سرداری میں پاکستان کی اقلیم ہو

مسلمِ ہندی علمبردارِ حرّیت رہے
دہر سے نامِ غلامی اس کی کوشش سے مٹے

امن و صلح و آشتی کا بڑھ کے یہ پیغام دے
اس کی اک آواز پر لبیک پھر دُنیا کہے

حیثیت اس کی ہے عالمگیر و آزادِ وطن
ہر جگہ آزاد ہو مسلم بفضلِ ذوالمنن

علی گڑھ 1945

اپنے دادا کے نام

قطعہ تاریخ بیادگارِ سالِ وفات جناب حاجی حافظ محمد علی صاحب قارؔی مرحوم و مغفور
انتقال پُر ملال بتاریخ 26 نومبر 1935 مطابق
29 شعبان 1354ھ بمقام سرولی ضلع غازی پور

مولوی و حاجی و حافظ محمد یا علی
فارسی میں شاعری کرتے تھے قارؔی نام تھا

مُنصفی کے اپنے ہم عصروں میں تھے نامی وکیل
شاعری میں ان کا ہمسر دُوسرا کوئی نہ تھا

درد کچھ ایسا اٹھا سینے میں ان کے دفعتاً
صبح تک بے چین تھے وہ درد بڑھتا ہی گیا

نو بجے ہونگے شبِ سہ شنبہ کو سوئے وہ جب
درد جب پیدا ہوا بارہ بجے کا وقت تھا

درد میں تخفیف وقتِ صُبح کچھ ہونے لگی
جُملہ معمولات سے فارغ ہوئے کھایا پیا

پھر بہ یک ناگاہ اُن کی سانس میں تیزی ہوئی
سانس گو جانکاہ تھی ان کو دمہ ہرگز نہ تھا

اپنے ہاتھوں کام سب چھوٹا بڑا کرتے رہے
گُل نمازیں بھی ادا کیں عُذرِ معذوری نہ تھا

خُوش دلی کے ساتھ سب سے بولتے ہنستے رہے
کھیلتے بچوں سے تھے آرام گو پل بھر نہ تھا

ہاتھ باندھا فرضِ مغرب پڑھ کر سنّت کے لیے
سُورتِ الحمد میں سجدہ کناں سر جھک گیا

روزِ سہ شنبہ نومبر کی تھی چھبیس حیف
اے حسؔن سایہ جب اپنے سر سے اُن کا اُٹھ گیا

لفظ ''جدّ'' کے ساتھ آیت کُلُّ نَفْسٍ کی حسؔن
پڑھ کے میں نے سالِ رحلت عیسوی میں لکھ دیا
1935ء

سالِ ہجری ''مقرب ظلِّ یزدانی'' شُد
1354ھ
سالِ عیسوی ''حافظ خموش''
1935ء

ہے کنواں یادگارِ رحم اللہ
حال پر ان کے رحم ہو اللہ
تھی محمد علی کو فکر اس کی
ان کے دم سے یہ یادگار رہی
بعد ان کے ابوالحسن ذی جاہ
نیک دل نیک طینت ۔ عالی جاہ
جن سے سب خاص وعام راضی ہیں
جو زمانے کے فخرِ رازی ہیں
ان کی خواہش ہوئی بصرفِ کثیر
ہو نئے سر سے اس کی پھر تعمیر
پیسہ ان کا شعیب کی محنت
چونکہ دونوں کی نیک تھی نیت

پانی ایسا لطیف اور شیریں
کہ اس کے اطراف میں کہیں بھی نہیں

فکرِ تاریخ عیسوی تھی حسنؔ
میں نہ شاعر نہ کوئی ماہرِ فن

پانی پی کر سمجھ میں آئی بات
''آستاں بوس آبِ شاخِ نبات''
1937ء

ہو ترو تازہ جس سے قلب و دماغ
سال ہجری ہے بابِ ''چشمۂ باغ''
1356ھ

ہے اسی ایک نام سے جاری
ہاں یہ چشمہ عرب میں بیرِ علی

ایسے محسن ہمیشہ رہتے ہیں
فیض جاری اسی کو کہتے ہیں

سب کے لب پر یہی ہے شام و پگاہ
یہ رہیں شاد و بامُراد اللہ

سرولی عرف پہتیا کا ایک یادگار کنواں جس کی تعمیر اور دیکھ بھال
حاجی مولوی ابوالحسن آئی ای ایس کی مرہون منت ہے
حافظ محمد علی دادا اور ابوالحسن والد ہیں
1937ء

شادیٔ خانہ آبادیٔ خود

ماں باپ کی مُراد ۔ اعزّا کا فخرِ عین
سہرا ہے سر پہ تیرے یہ کتنا حسنؔ سعید
خوش باش زندہ باد سدا ہے یہی دُعا
کثرت ہو آل و مال کی لُطفِ خدا مزید
تاریخ پوچھی میں نے تو ہاتف نے یُوں کہا
کہ چاہتے ہیں گر وہ درِ عیش کی کلید
اعدا بھی کدّ نکال کے دل سے پکار اُٹھیں
''ہر شام شبِ برات ہو ہر صُبح عید''

1927ء

9نومبر 1927

مثنوی فروغِ بزم

1941ء

یعنی

جوہرِ مکنونِ شریعت

1360ھ

مطبوعہ اختر پرنٹنگ ورکس علی گڑھ

مثنوی فروغِ بزم

نہ تھا جب کچھ تو بس اللہ کی اک ذاتِ واحد تھی
جو پہچانے اُسے ایسی نہ تھی پیدا کوئی ہستی

خدا نے نور سے اپنے فرشتوں کو کیا پیدا
فرشتے جان و دل سے اپنے خالق پر ہوئے شیدا

فرشتوں نے خدا کے حکم سے ہر چیز پیدا کی
جو شے پیدا ہوئی کس سے بیاں ہو اس کی زیبائی

ہوئی جنّات کی تخلیق پھر منظور خالق کو
مشیّت تھی کہ ان میں نار کا عنصر ہی غالب ہو

غُلو جنّات نے حمد و ثنا میں پھر کیا اتنا
فرشتوں پر شرف اللہ نے جنّات کو بخشا

مقرّب بارگاہِ ایزدی کا ہوگیا شیطان
فرشتوں کی اتالیقی پہ فائز پھر ہوا شیطان

یہ سبقت نُوریوں پَر پا کے اس میں کچھ غرور آیا
ہوئی نخوت جو پیدا عقل میں اس کی فتور آیا

مشیّت تھی تکبّر کی ملے اس کو سزا پوری
خدا نے ایک مُشتِ خاک سے تخلیقِ آدم کی

کہ تم کو قتل کرنے لشکرِ جرّار آیا ہے
غنیموں کا اسی ٹیلے کے پیچھے آج ڈیرا ہے

تو سب نے ایک زباں ہوکر کہا باور کریں گے ہم
کہ تو سچا ہے تیری بات کو بیشک سنیں گے ہم

مگر پیغامِ توحید اس نے جب لوگوں کو پہنچایا
خیالِ ماسوا کو ترک کر دینے کو فرمایا

تو شیطانِ لعیں نے ان کو بہکایا کہ یہ کیا ہے
تمہارے دیوتا جھوٹے نہیں یہ بات بیجا ہے

لگی کان اور دل پر مُہر آنکھوں پر پڑا پردا
بکے اس ہادیٔ برحق کے اکثر ان میں سے اعدا

بہت ایسے تھے جو خاموش سن کر محوِ حیرت تھے
کچھ ایسے بھی تھے جو صادق تھے شیدائے صداقت تھے

تسلّط جن پہ شیطانِ لعیں کا ہوگیا پورا
خدا سے منحرف ہوکر وہ خود اپنے بنے اعدا

مقدّر ہی میں تھی ان کے ضلالت اور گمراہی
نصیب ان کو ہوئی دونوں جہاں میں ذلّت و خواری

جو حیراں رہ گئے تھے ان میں اکثر راہ پر آئے
انہوں نے گوہرِ مقصودِ دل انعام میں پائے

مراتب کیا کہوں پروانۂ شمعِ نبوت کے
خدا جانے خدا کا برگزیدہ وہ نبیؑ جانے

یہ شیرِ بیشۂ توحید ایذاؤں کو سہتا تھا
مگر تبلیغِ حق کی دُھن ہی میں دن رات رہتا تھا

فضائے ہوش پر بادل جو تھا وہ چھٹتا جاتا تھا
خدا کے تھے جو منکر زور ان کا گھٹتا جاتا تھا

براہیمی امانت کا وہ حامل بن کے آیا تھا
وہ موجودات کی خلقت کا حاصل بن کے آیا تھا

وہ بحرِ بیکرانِ غم کا ساحل بن کے آیا تھا
اندھیری رات میں اک ماہِ کامل بن کے آیا تھا

وہ بے جاں قالبوں کے واسطے دل بن کے آیا تھا
وہ حیوانوں میں اک انسانِ کامل بن کے آیا تھا

ابو جہلوں میں وہ اک مردِ عاقل بن کے آیا تھا
وہ اُمّی تھا مگر صدرِ افاضل بن کے آیا تھا

وہ تعلیمات پر خود اپنی عامل بن کے آیا تھا
ہدایت پر خطا کاروں کے مائل بن کے آیا تھا

وہ کفر و دیں میں اک حدِّ فاصل بن کے آیا تھا
خدا اور عبد میں اک ربطِ واصل بن کے آیا تھا

زبردستوں کا مولا اور کمزوروں کا وہ والی
پلائے شیر اور بکری کو جو اک گھاٹ پر پانی

اُسے کس کس طرح شیطان کے پیرو ستاتے تھے
جدھر جاتا تھا اس کی راہ میں کانٹے بچھاتے تھے

نمازوں میں اسے ایذائیں دیتے تھے معاذ اللہ
اسے پتھر بھی کم بختوں نے مارے تھے معاذ اللہ

ستایا حق پرستوں کو جہنم کے مکینوں نے
وطن سے بے وطن بھی کردیا اُنکو لعینوں نے

انہیں صحرا کی تپتی ریت پر لاکر لٹاتے تھے
انہیں دو پتھروں کے بیچ میں لے کر دباتے تھے

کسی کو کس کے دو اونٹوں پہ ٹانگیں چیر دیتے تھے
کسی کو مارتے تھے اور کسی کے ہونٹ سیتے تھے

درختوں سے کسی کو باندھ کر لٹکا دیا اُلٹا
کسی پر اوجھڑی لادی کسی کو دار پر کھینچا

یہ مظلوموں نے کی فریاد اب حد ہوچکی غم کی
خدا سے عرض کیجیے ہو تباہی قومِ اظلم کی

کہا اُس رحمت للعالمینؐ نے قہر کیوں مانگوں
کہ میں سب کے لیے پیغامِ رحمت لے کے آیا ہوں

یہ اعدا حق کے جو کرتے ہیں کرنے دو نہ گھبراؤ
تمہارا رب تمہارے ساتھ ہے آگے بڑھے جاؤ

کہیں پُھونکوں سے بُجھتی ہے تجلّی نورِ عرفاں کی
ہوا روکے تو کشتی تیز چلتی ہے مسلماں کی

نہ قہر آیا خدا کا اور نہ دنیا تھی تہ و بالا
ہوئیں لیکن فضائیں باطل و حق کی تہ وبالا

وہ محبوبِ خدا جو گھر سے اس حالت سے نکلا تھا
نہ کھانے کو میسّر تھا نہ اُس کے پاس پیسا تھا

وہی پھر ایک فاتح کی طرح واپس وطن آیا
کہ گویا موسمِ گُل جاکے پھر سُوئے چمن آیا

خزاں دیدہ چمن میں وہ شمیمِ جانفزا آئی
کہ صورت ہی بدل دی جس نے تقدیرِ گلستاں کی

کبھی مظلوم فاقہ کش تھا عُسرت تھی غریبی تھی
اور اب اِک بادشہ تھا اور فقیری اختیاری تھی

فقیری پر وہ نازاں تھا فقیری اس پہ نازاں تھی
دکھائی شان اس نے بادشاہی میں فقیری کی

حقوق الناس بتلائے حقوق اللہ سمجھائے
جو حیواں تھے انہیں انسان کے اوصاف سکھلائے

درندوں کو مساوات و اُخوّت اس نے سکھلائی
بہائم میں محبت اور اُلفت اس نے پیدا کی

تمدّن کے ہر اک پہلو کو اُس نے خوب سمجھایا
پلٹ دی آنِ واحد میں غلط تہذیب کی کایا

حقوق عورت پہ مردوں کے جہاں واجب کیے اس نے
حقوق عورت کے مردوں پر بھی لازم کر دیے اس نے

بڑوں کا جب ادب چھوٹوں پر اس نے فرض ٹھہرایا
تو اسکے ساتھ ہی چھوٹوں کا بھی حق اس نے بتلایا

رعیّت کو اطاعت کی جہاں تعلیم دی اُس نے
وہاں راعی کو بھی تلقین کی انصاف کی اُس نے

فصاحت سے اُسی کی ہم نے صدق و کذب کو جانا
وضاحت سے اسی کی دوست اور دشمن کو پہچانا

میانِ حق و باطل امتیاز اس نے کیا پیدا
بنایا نفسِ سرکش کو بھی حق پر مائل و شیدا

خدا نے علم جو اس کو دیا اس نے دیا ہم کو
ملا جو کچھ خدا سے اس کو اس نے دے دیا ہم کو

وہ زیبِ مسندِ دل زینتِ بزمِ رسالت ہے
خدائی میں اسی کے سر پہ دستارِ صدارت ہے

خدا اس کا ہے موجودات پر اُس کی حکومت ہے
وہ خود مجبور ہے لیکن اسے ہر شے پہ قدرت ہے

وہ قرآنِ مجسّم ترجمانِ دین و ملت ہے
وہ محبوبِ خدا پروانۂ شمعِ محبت ہے

وہ شمسِ بے زوالِ مَطلعِ انوارِ رحمت ہے
بہارِ بے خزانِ گلشنِ فردوسِ راحت ہے

وہی رُوح و روانِ جسمِ بے جانِ شریعت ہے
اسی کے دم سے شریانِ طریقت میں حرارت ہے

اُسی کے فیض سے یہ عظمتِ صدق و صداقت ہے
اُسی کے دم قدم سے رونقِ ایوانِ عزت ہے

اسی کے بل پہ انساں عاملِ بارِ امانت ہے
اسی کی دی ہوئی کمزور ہاتھوں میں یہ طاقت ہے

کرم اس کا سراسر قاطعِ بغض و عداوت ہے
کہ اس کا سینہ اِک گنجینۂ مہر و محبت ہے

اُسی کی سیرتِ اقدس پہ معیارِ شرافت ہے
اُسی کی پیروی عفوِ معاصی کی ضمانت ہے

وہی ذاتِ گرامی منبعِ جود و سخاوت ہے
اُسی کا فرقِ اقدس زینتِ تاجِ شفاعت ہے

وہ خضرِ راہِ عرفاں رہبرِ راہِ حقیقت ہے
وہ ہر گُم کردہ رہ کے واسطے شمعِ ہدایت ہے

جو اُس کا جان و دل سے ہوگیا اس کو فضیلت ہے
بھٹکنا راہ سے اس کی رذالت ہے ضلالت ہے

ہمیں لازم ہے تعلیمات پر اس کی رہیں قائم
جو رہ اس نے بتائی ہے اُسی رہ پر چلیں دائم

فلاحِ دین و دنیا ہے اسی اِک راز میں مضمر
کریں جو کچھ کریں اُس کی ہدایت سامنے رکھ کر

مثنوی خدمتِ ماموره

1942ء

یعنی

سیاستِ امین الامم ملتِ اسلامیہ

1361ھ

کہا اک روز میں نے با ادب اک عالمِ دیں سے
کہ اسلام اور آزادی کی بابت آپ کچھ کہیے

یہ فرمایا کہ ہر ذی رُوح کی فطرت ہے آزادی
ہر انساں کے لیے سرمایۂ راحت ہے آزادی

غلامی فطرتِ انسانیت سے اک بغاوت ہے
غلامی بربریّت کے گلے کا طوقِ لعنت ہے

غلامی کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا
مساوات و اُخوّت کا یہی پیغام لایا تھا

حجابِ لاالٰہ میں ہے رازِ حُریّت مضمر
کہ انساں ماسوا سے ہر علاقہ توڑ دے یکسر

پھر الا اللہ کہہ کر اعترافِ بندگی کرلے
بس اک اللہ کے آگے جھکے دنیا سے منہ موڑ لے

کہا میں نے کہ آزادی بہائم کا طریقہ ہے
تو فرمایا کہ تجھ کو گفتگو کا بھی سلیقہ ہے

کہا میں نے کہ حضرت بات میری آپ سن لیجے
تو فرمانے لگے بس سن چکا میں آپ بس کیجے

میں ایسی بے محل الحاد کی باتیں نہیں سنتا
خدا سے اور نبیؐ سے اور خدا کے دین سے ٹھٹھا

یہ میں نے دست بستہ عرض کی سن لیجے صاحب
اور اس کے بعد پھر فتویٰ مناسب دیجے صاحب

خدا سے اور نبیؐ سے اور خدا کے دین سے ٹھٹھا
یہ گستاخی ! معاذاللہ میں ایسا نہیں کرتا

ابھی خود آپ نے جو ہر بتائے ہیں یہ انساں کے
کہ اک اللہ کے آگے جھکے دنیا سے منہ موڑے

وہ میری بات کو پھر کاٹ کر رطب اللساں ہوتے
کہا میں نے بلند آواز میں یہ تُرش روئی سے

کہ حضرت گفتگو کا یہ طریقہ کس سے سیکھا ہے
مبلّغ کے لیے یہ ناروا ہے سخت بے جا ہے

تامّل سے جو میں کہتا ہوں اس کو آپ سن لیجیے
اگر الحاد و گستاخی ہو تو اصلاح کردیجیے

اگر خود آپ برہم ہوگئے تو کام کیا ہوگا
بتا دیجیے کہ اس تبلیغ کا انجام کیا ہوگا

مسلماں کی تسلی آپ سے گر ہو نہیں سکتی
تو کس کمبخت کافر کی تشفّی آپ سے ہوگی

لب اعجاز سے ارشاد فرمایا، تو کافر ہے
مسلماں نام کا ہوگا مگر کافر سے بدتر ہے

کرم فرما وہاں قانون پیشہ ایک بیٹھے تھے
انہیں طیش آرہا تھا گالیاں بکتے ہوئے اُٹھے

کھڑے ہوکر انہوں نے ایک دم سو گالیاں دیدیں
کہا یہ مولوی ملاّ و مولانا ہیں سب بے دیں

انہوں نے دین کو اک کھیل لڑکوں کا بنایا ہے
اِنہوں نے اپنی خود غرضی سے اک فتنہ اُٹھایا ہے

غرض اک سانس میں کہتے رہے جو منہ میں آتا تھا
پرائے کا نہ ان کو ہوش تھا کچھ اور نہ اپنا تھا

ہراساں دم بخود محوِ تماشا تھے تماشائی
عمومیت لیے تھی اس طرف معصوم ملاّ جی

لپک کر ان کو پکڑا میں نے اور کرسی پہ بٹھلایا
مخاطب ہو کے مولانا سے پھر میں یوں ہُوا گویا

کہ حضرت دیکھیے آزاد دیوانے کو کہتے ہیں
بہائم اور پاگل قید سے آزاد رہتے ہیں

ہے فرزانوں کو ہر ہر گام پر اک قید آئینی
انہیں پابندیوں کا نام ہے تہذیبِ انسانی

یہی تہذیبِ انسانی ہے واحد کام مذہب کا
خدا کا اور نبیؐ کا اور خدا کے دین کا منشا

کرے انسان جو چاہے گدائی ہو کہ شاہی ہو
مگر ہر کام میں ملحوظ خوشنودِ الٰہی ہو

یہ دنیا قیدخانہ عمر بھر کا ہے مسلماں کو
یہاں جب تک رہے پابندیاں لازم ہیں انساں کو

یہاں سے چھوٹ کر آزاد رہنا اس کا حصہ ہے
یہاں کی قید میں آزاد مطلق کا جو بندہ ہے

سیاست میں غلامی کہتے ہیں محکوم ہونے کو
رئیسوں کے ستم سہنے کو اور مظلوم ہونے کو

ستم جور و جفا کرنے کی طاقت ہو تو آزادی
نہ طاقت ہو اگر جور و جفا کی تو ہیں فریادی

غلامی اور آزادی یہاں ہوتی ہے جسمانی
مگر اسلام میں معیارِ آزادی ہے روحانی

اگر اسلام پر پابندیاں ہوں جنگ کرنا ہے
اگر آزاد ہو مذہب تو محکومی گوارا ہے

مثال اِس کی ملے گی ہجرت اوّل سے حضرت کو
نہ بھولا آج تک مسلم نجاشی کی عنایت کو

عرب سے چند حُر جاکر حبش میں زیرِ فرماں تھے
مگر فرمانروا کے لطف کے ممنونِ احساں تھے

بدل ڈالیں مسلمانوں کی شمشیروں نے تقدیریں
مگر ملکِ حبش پر سایہ افگن تھیں یہ شمشیریں

رعیّت سَو میں نوے سے زیادہ کلمہ گو ہوگی
ولیکن آج بھی رائی حبش کا ہے اک عیسائی

غضب ہے اب مسلماں قید جسمانی سے گھبرائے
مگر مذہب پہ آنچ آئے تو وہ ہرگز نہ گرمائے

وطن اور جسم خاکی کو مقیّد دیکھ کر تڑپے
غلاموں کا سہارا لے لگائے ''قوم'' کے نعرے

میں ہرگز یہ نہیں کہتا نہ کیجے جنگ آزادی
مگر یہ جنگ ہو بہر خدا ہر گونہ اسلامی

لڑائی دشمنوں سے ہو خدا کے اور ملت کے
یہ خالص امن کی خاطر ہو اور خالی ہو ہر شر سے

کہ اسلامی مجاہد ہار سکتا ہی نہیں بازی
شہیدِ قوم ہے مرنے پر اور جینے میں ہے غازی

خدا کے دشمنوں سے آپ اعلانِ حَرب کردیں
مگر اسلام کے ناموس کو ہرگز نہ یوں سمجھیں

کہ اک دشمن سے لڑنے جائیں اور اک ساتھ ہو دشمن
کہ ہو شمشیر تو بہر عدو اور ہاتھ ہو دشمن

شکستِ فاش لازم ہے مآل ایسی لڑائی کا
کہ اک اسلام کا دشمن بہر آئینہ جیتے گا

شریکِ فتح گر بالفرض ہوں بھی آپ تو کیا ہے
کہ پھر تازہ مظالم کا ہدف سرکار ہونا ہے

خدا کے دشمنوں سے جنگ کرنا جب مقدر ہے
تو پھر تنظیم خود اپنی جماعت ہی کی بہتر ہے

خدا کا حکم ہے ہرگز نہ کیجے جنگ میں سبقت
مگر مضبوط سے مضبوط تر ہو اپنی جمعیت

حریف اسلام کا جو بن کے آئے اس کو زک دیجیے
اگر لڑتے ہیں دو موذی لڑیں اپنی بچت کیجیے

یہی زرّیں اُصولِ **لیگ** ہے اپنا تحفظ ہو
کوئی حاکم ہو یا محکوم ہو چھیڑے نہ وہ ہم کو

فریبِ **کانگرس** ہے لفظ **آزادی** کے پردے میں
یہ آزادی کو کیا جانیں نہ آنا اِن کے دھوکے میں

یہ ممکن ہے کہ ان میں نام کے آزاد پیدا ہوں
مگر ممکن نہیں اسلام کے آزاد پیدا ہوں

اگر آزاد ہندوستان میں آزاد ہو رہنا
رہے پیشِ نظر ہر وقت پاکستان کا نقشا

یہ مولانا نے فرمایا کہ بے شک بحث اچھی ہے
تعالی اللہ اس تقریر میں کیسی روانی ہے

حسؔن صاحب سیاست **لیگ** کی مجھ کو پسند آئی
میں سمجھا ہی نہ تھا اب **لیگ** کا ہوں دل سے شیدائی

بڑھے دونوں طرف سے ہاتھ بے حد گرمجوشی سے
کھڑے ہوکر مجھے لپٹا لیا سینے سے حضرت نے

زباں پر ماشاء اللہ تھا سبحان اللہ جزاک اللہ
کہا میں نے علوم دینیہ سے میں نہیں آگہ

علومِ حاضرہ پڑھ کر سیاست جانتا ہوں میں
فریب و مکر کی چالوں کے گُر پہچانتا ہوں میں

مجھے معلوم ہیں شطرنج کے مُہروں کی سب چالیں
بساطِ دہر پر شاطر کو دے سکتا ہوں میں ماتیں

میں راہیں جانتا ہوں پیچ و خم سے خوب واقف ہوں
مجھے منزل پہ پہنچائے گی اک دن گردشِ گردوں

مگر اک مشعلِ رہ چاہیے میری ہدایت کو
ضیا پاشی کرے قرآن تو آسان منزل ہو

ہمیں ان عالمانِ دین کی بے حد ضرورت ہے
کہ اس ظلمت کدے میں علمِ دیں شمعِ ہدایت ہے

اگر قرآن شمعِ راہ ہو تو کام آساں ہو
زمانے میں جدھر دیکھیں مسلماں ہی مسلماں ہو

مثنوی بادِ مخالف

1364ھ

1945ء

از حسن عبداللہ حسنؔ
ایم اے۔ایل ایل بی
اسٹیوارڈ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ

قومِ مسلم تو ہے اک ملّت بہ فضلِ کردگار
تابعِ فرمان تیرے گردشِ لیل و نہار

انفرادی حیثیت افراد کی کچھ بھی نہیں
اجتماعی طور پر تُو حاملِ عرشِ بریں

ہر مسلماں بے نیازِ معنیٔ موت و حیات
پائمالِ سیف الا للہ ہیں لات و منات

دولت و جاہ و مناصب منفعت فرزند و زن
اشتہا خوفِ زیاں محرومی و رنج و محن

لازماتِ زندگی اسکے بھی ہیں اوروں کے بھی
ہے نرالا پھر بھی دُنیا سے شعارِ زندگی

غیر جیتے اور مرتے ہیں بس اک اپنے لیے
زندگی اور موت اس کی ہے خدا کے واسطے

اس کی جمعیت ہی میں مضمر بقا کا راز ہے
اس کے درپَے پر عدوئے تفرِقہ پرداز ہے

یورپی تہذیب کے اثرات یہ ظاہر ہوئے
ملّتِ اسلامیہ بے سر ہوئی حصے بٹے

حیف تُرکی میں ہُوا معزول امیر المومنیں
ہوگئی مجروح اس سے سطوتِ رُوئے یقیں

اقتادی اور معاشی ذہنیت پیدا ہوئی
اور تُرکی قوم اپنے مُلک پر شیدا ہوئی

مُلک تُرکوں کا سیاست ان کی تُرکوں کے لیے
مادّیت کے سبق تُرکوں کو یورپ نے دیے

یہ وبا تُرکی سے نکلی اور پھیلی دُور دُور
عالمِ اسلام میں پیدا ہوا شورِ نشور

منتشر شیرازۂ ملّت نظر آنے لگا
جذبۂ ناپاکِ اعدا تقویت پانے لگا

حبش اور البانیہ ٹیونس مراکش مصر و شام
کابل و ایران عراق و چین و جاوا اور سیام

رفتہ رفتہ سب سلاسل میں جکڑ ڈالے گئے
جن کو غیرت نے اُبھارا وہ وہیں مارے گئے

گھر یہودی کا بنے ارضِ مقدس کیا مجال
یہ مگر اسلامیوں کے تفرقوں کا ہے مآل

آج ہندوستان میں کیا حال ہے اس قوم کا
سخت طوفاں میں ہے کشتی سو رہا ہے ناخُدا

عالمانِ علمِ دیں اعدا کی سازش میں شریک
خاکساروں کی معاذ اللہ حرکاتِ رکیک

مومن و شیعہ قریش آزاد مُسلم کے گروہ
ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں بیچ کر اپنا شِکوہ

جنگ تھی کفار کے جھوٹے خداؤں کے خلاف
لڑ رہی ہے آج وہ خود آپ اپنوں کے خلاف

گالیاں لات اور ڈنڈی گپتیاں سیف و تفنگ
بے محل کام آرہی ہیں حیف یہ آلاتِ جنگ

خانہ جنگی کا جنوں چاروں طرف ہے جوش پر
خندہ زن اغیار ہیں ہیہات ان کی ہوش پر

اک طرف جمعیتِ ملّت کی تبلیغی پُکار
دُوسری جانب یہ ذیلی فرقہ بندی کا خُمار

پھر یہ کمبختی عداوت بُغض و کینہ اور عناد
ایک بھائی کے زیاں میں ایک بھائی کا مفاد

بانٹ کر کھانے سے ان کا پیٹ بھرتا ہی نہیں
ہڈیوں پر جنگ ہے کتّوں کی عادت سے قریں

ہے عبث فریاد کرنا دشمنِ جاں کے خلاف
کیا ستم ہے خود مسلماں ہے مسلماں کے خلاف

دھمکیاں وعدے وظائف اشتعالِ بُغض و شر
تفرقہ پردازیاں مکر و فریب اور کرّ و فر

جس طرح ممکن ہو اعدا خانہ جنگی میں معیں
سادہ لوحوں کا بنا ہے دوست مارِ آستیں

ایسی ملّت حرّیت کی جو علمبردار ہے
آستاں بوسی غیر اللہ سے جس کو عار ہے

خود سر و ظالم کو جو پل بھر کبھی مہلت نہ دی
جو مساوات و اخوّت سے جہاں بانی کرے

جس کا معیارِ شرافت زہد و تقویٰ اور عمل
رحم و اخلاق و رواداری میں تو ضَربُ المثَل

جس کا ہر ہر فرد آزادی کا متوالا رہے
جان و مال و آل و زن اسکے لیے قرباں کرے

جو صحیح مفہوم آزادی کا سمجھے اور بتائے
جو غلاموں کو اصولِ جنگِ آزادی سکھائے

آج اس ملّت میں لیکر حیف آزادی کا نام
پُھوٹ ڈالی جارہی ہے اور ہے یہ اتہام

دیکھو مسلم لیگ کو یہ ہے غلام انگریز کی
ملک کو آزاد کرنے کی نہیں کرنی سعی

کانگریس آزادئ ہندوستاں کی مُدّعی
صدر ہے آزاد یہ ابلہ فریبی آپ کی

ڈھونگ یہ ایسا رچایا کانگریس نے برمحل
سونت کر تلوار کچھ میدان میں آئے نکل

ان میں کچھ عالم تھے کچھ احرار و طفلانِ غیور
جوشِ آزادی تھا جن کے پاس قلبِ ناصبور

ساتھ ان کے نا سمجھ افراد بھی کچھ ہوگئے
جن کو بھائے حیف ہنگامہ پسندی کے مزے

خاکساری کے بظاہر تھے یہ ظالم مُدّعی
تھے مگر نا واقفِ رمزِ گدائی و شہی

مومن و شیعہ فریبِ فرقہ بندی کے شکار
وہ نہیں جن پر حقیقت ہوگئی صاف آشکار

خیرہ چشم ان میں تھے کچھ مرعوب نظمِ روس سے
جن پہ روشن ہی نہ تھے بالکل اصول اسلام کے

جو مساوات و زکوٰۃ و صدقہ سے بیگانہ تھے
ذہنیت جن کی غلامانہ تھی دل رندانہ تھے

جذبۂ تقلید کورانہ و ذاتی منفعت
یا وظیفہ اور مناصب کی ہوس یا سوقیت

کھینچ لائی چند اوباشوں کو ان لوگوں کے ساتھ
اور حمیّت بیچ ڈالی سب نے ہندوؤں کے ہاتھ

یہ بزعمِ خود دھنی کہلائے آزادی کے حیف
بے تحاشا چھینکنے میں محو ہیں وہ دستِ سیف

کشتگانِ ناز کی اصلا انہیں پروا نہیں
فکر ہے خالی چلا جائے نہ وار ان کا کہیں

دوست اور دشمن کی اب باقی نہیں ان کو تمیز
دشمنانِ ملّتِ اسلام ہیں ان کو عزیز

دیکھتے سنتے ہیں یہ اب اُن کے چشم و گوش سے
نشۂ پندارِ حریت میں ہیں مدہوش سے

اپنے بیگانے بنے بیگانے اپنے ہوگئے
اس طرح منصوبے اب اعدا کے پورے ہوگئے

اپنی ملّت چھوڑ کے یہ بے سہارا ہوگئے
گھر سے بھی مردُود ہیں اور گھاٹ سے بھی کھوگئے

جو مسلماں ہے غلامی سے اسے انکار ہے
خواہ وہ محکوم ہی ہو پھر بھی خود مختار ہے

آج انگریزوں کی محکومی ہے کل ہندو کی ہو
ایسی آزادی پہ سو پھٹکار ہے اے مسخرو

ہندوؤں کے بل پہ لڑنے آئے ہو انگریز سے
اور تمہاری تیغ سے کٹتے ہیں اپنوں کے گلے

کیا لڑائی لڑ رہے ہو اور کس دشمن سے تم
سوچ لو نزدیک تر ہندو ہے یا خرمن سے تم

ہو خدا کے بل پہ جمعیت کی طاقت مجتمع
جنگ ہو اللہ کے اعدا سے بے حرص و طمع

خواہ وہ انگریز ہو ہندو یا غدارِ قوم
وہ کسی بہروپ میں آئے مگر ہے خوارِ قوم

جنگ مسلم لیگ کی یکساں ہے ہر دُشمن کے ساتھ
جب لٹے خرمن تو حصہ آئے اپنا اپنے ہاتھ

ہم جُوا انگریز کا گردن سے فوراً پھینک دیں
پرچمِ آزادیٔ ہندوستاں لیں ہاتھ میں

ہاں مگر آزاد ہندوستان میں آزاد ہوں
شاد ہوں سب ہند والے اور ہم بھی شاد ہوں

یہ نہیں ہم کو گوارا ہے رہیں محکوم ہم
طوق ہو زیبِ گلو اپنے ہوں یا معدوم ہم

ایسی آزادی وطن کی ہے بجائے خود عذاب
جس میں ہم رُسوا رہیں اعدا بنیں مالک رقاب

کیا بُلاتے ہو ہمیں میدان میں غیروں کے ساتھ
تا کہ ہم بھی بیچ دیں ناموسِ ملّت ان کے ہاتھ

تم تأمُّل سے اگر تھوڑا سا اب بھی کام لو
آؤ حریّت کے متوالو ہمارا ساتھ دو

ہند میں نقشہ بنادیں آؤ پاکستان کا
لیں سہارا قوتِ بازو کا اور ایمان کا

پھر نظر نزدیک تر فتح و ظفر آنے لگے
پرچمِ نصر من اللہ سر پہ لہرانے لگے

چھوڑ جائیں ہند کو انگریز سب آزاد ہوں
مختلف قومیں وطن میں شاد ہوں آباد ہوں

ہندوؤں کے واسطے ہندوستاں میں نعمتیں
اور پاکستان کی سب رحمتیں ہم کو ملیں

جنگِ آزادی میں پھر تم کو مزا آنے لگے
ہر مجاہد پھر شجاعت کا صلہ پانے لگے

تم نے آزادی کو سمجھا ہے کہ ہم نے سوچ لو
جنگ ہے کس کی مُبارک اور اسلامی کہو

فیصلہ ہے کیا مبارک عقل اور اسلام کا
ہو جہالت اور نہ ضد گر خوف ہے انجام کا

ہم دُعا گو ہیں خدا توفیق و عقل و ہوش دے
نُورِ ایماں سے منوّر ہوں تمہارے فیصلے

جنگِ آزادی لڑیں یکجہتی و ہمّت سے ہم
ہم سے ملّت کی بقا ہے اور ہیں امّت سے ہم

دُشمنانِ ملّتِ بیضا ہمیں پہچان لیں
چھیڑنا ہم کو نہیں اچھا یہ اعدا جان لیں

آج بھی رکھتے ہیں پوشیدہ تہِ داماں شرر
*جوہری طاقت بھی ہے جس کے مقابل بے اثر

یوں تو امن و صلح میں مسلم کسی سے کم نہیں
ہاں مگر جو چھیڑ دے یا وہ نہیں یا ہم نہیں

*Atomic Energy

اُن سے کہہ دو آج آزادی کا جو بھرتے ہیں دم
اور فریبِ حریّت دیتے ہیں تم کو دم بدم

آئیں آزادی جو چاہیں ہم کو پاکستان دیں
ہم وطن آزاد کرنے کے لیے پھر جان دیں

دیکھ لیں قربانیوں کا کس کو بہتر ہے شعور
آج سب مل جائیں ہو طوقِ غلامی آج دُور

اُن کا مقصد ہے یہ کب خود ان کے دل میں چور ہے
ہر تدبرّ صرف اک ہر اصولِ زور ہے

تا کہ وہ جَور و ستم کرنے میں خود آزاد ہوں
اور پَیاپَے ملّتِ معصوم پر بیداد ہوں

یہ گوارا ہے نہ ہوگا ہم فنا ہوجائینگے
تازہ پھر سب واقعاتِ کربلا ہوجائینگے

ہم نہ ہوں لیکن خدا کا نام تو رہ جائیگا
یادگار اپنا ہمیشہ نام تو رہ جائیگا

خون کے آنسو حسنؔ روتے ہیں ہم آج اس لیے
ہے عدو پردے میں آخر سیف اپنی کیا چلے

کاش اپنے ساتھ عدو کا چھوڑ دیں پھر جنگ ہو
روم کا بھی یارا نہ ہو میدان اس پر تنگ ہو

چھوڑ دیں انگریز مُلک ہتھیار ہندو ڈال دیں
دونوں پاکستان کی ہر شرط فوراً مان لیں

زورِ حیدرؓ ہو عطا اور دبدبہ فاروقؓ کا
غیرتِ عثمانؓ دے ایمان دے صدیقؓ سا

صبرِ ایوبی عطا کر یا الٰہی اب ہمیں
استقامت دے حسینؓ ابنِ علی کی رب ہمیں

قومِ مسلم کو الٰہی پھر وہ ملّی شان دے
عقل دے توفیق دے علم و عمل ایمان دے

نامکمل غزلیں

کچھ دیدۂ تر تیرا پائے تو پتہ پائے
ہر دیدۂ ظاہر میں اک نرگسِ حیراں ہے

وسعت دلِ وحشی کی ہے خود ہی جنوں افزا
وحشت پہ جو آجاؤں زنداں ہی بیاباں ہے

وحشت نے مرے دل کی اس دشت میں پہونچایا
جس دشت کا ہر ذرّہ وسعت میں بیاباں ہے

ہُوا جاتا ہوں یا رب آپ اپنے سے میں بیگانہ
ہوائے مشکِ بوئے گلستاں نا سازگار آئی
نشیمن کے لیے سوکھے ہوئے تنکے نہیں ملتے
خوشی کیا خاک ہو ہم کو کہ گلشن میں بہار آئی
چمن میں یا الٰہی آج کس کی آمد آمد ہے
جسے دیکھو نظر آتا ہے محوِ گلشن آرائی

وسعتِ پیمانۂ دل ساقیا کیا پوچھنا
تو ہی کہدے کس قدر مے تیرے پیمانے میں ہے
بعد مردن گور پر مشقِ خرامِ ناز ہے
ہم سمجھتے تھے کہ کچھ آرام مرجانے میں ہے
لاش میری دیکھ کر تم آبدیدہ ہوگئے
بے زبانی پر یہ جادو میرے افسانے میں ہے

✿

یہ کیا ہے کہ سرمستِ ہوش و خرد ہوں
مجھے آپ اپنے سے بیگانہ کر دے
جو گزری ہے مجھ پر وہی کہہ رہا ہوں
حقیقت کو تو چاہے افسانہ کر دے
ہے دل ان کے آنے سے پہلے ہی مضطر
یہ ناموسِ اُلفت کو رُسوا نہ کر دے
یہ کیسا ہجومِ تمنا خدایا
مرا دل ہے آباد ویرانہ کر دے

✿

لاکھ تدبیریں کرے کوئی بدل سکتا نہیں
کاتبِ تقدیر نے جو لکھ دیا تقدیر میں
طاقتیں دی ہیں مگر انسان کو اللہ نے
نا سپاسی ہے اگر تقصیر ہو تدبیر میں

قطعہ

اسیرانِ محبت را رہائی خوش نمی آید
مرا ذوقِ اسیری می بُرَد رقصاں سُوئے زنداں
بہ سر سودائے اُلفت بعدِ مُردن ہم نہ کم گردد
عبث اے چارہ گر بُردن تن بجاں سُوئے زنداں

اساتذہ اور چاہنے والوں کے تاثرات اور تحریروں کے عکس

R. A. SIDDIQI,
CHAIRMAN.

DEPARTMENT OF URDU.
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH.

۲۷ فروری

حسن عبداللہ صاحب میرے طالب علم رہ چکے ہیں۔ میں انکو بچپن سے
ان کے خاندان اور ان کے بزرگوں سے بخوبی واقف ہوں جو نہ صرف علم و ادب بلکہ اپنی ریاست
کی حکومت کے بڑے ممتاز مناصب پر فائز رہے ہیں اور بڑے وقار سے عزت و نیکنامی سے۔
حسن عبداللہ صاحب اس یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کر چکے ہیں
اور میرے رفقائے کار نے ۲ سال مسلسل انکا ساتھ دیا ہے۔ انھوں نے
بڑی محنت اور محبت سے پڑھا ہے اور یہی سبب ہے کہ زبان و ادب پر انکی
نظر بہت اچھی ہوتی ہے۔ اتنی اچھی کہ انکا ذوق سلیم اور اصابت نظر کا
میں قائل ہوں۔ اردو میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لئے حسن صاحب یورپ تشریف لے گئے
وہاں کی مشہور یونیورسٹی لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں
تحقیق و ترتیب کا کام کر رہے تھے، تحقیقات کے سلسلہ میں انکو ہندوستان واپس آنا
پڑا اور خلاف توقع خاصا وقت لگ گیا۔ لندن اسکول نے انکو اپنا کام یہیں ختم
و مکمل کرنے کی اجازت دیدی۔ حسن صاحب اسی کام میں مصروف و منہمک ہیں۔
حسن صاحب نہایت اچھے نوجوان ہیں۔ پاکیزہ سیرت پائی ہے۔
یہاں وہ اساتذہ اور طلبہ دونوں میں اپنی قابلیت اور پسندیدہ اطوار کی بنا پر
بہت مقبول رہے ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ نہایت اچھے استاد ثابت ہونگے
نام کی جو ہوا آئی نہیں ہیں لیکن شریف مسلمان گھرانوں میں ابتدا سے جس طرح
عربی فارسی تعلیم خوب حاصل کی جاتی ہے۔ حسن عبداللہ صاحب نے فارسی کی
اچھی اور قدیم اسکولوں کی معلومات بہم پہنچائی ہے اسلئے انکی استعداد اس زبان میں
بہر نوع قابل التفات رہی ہے۔

حسن صاحب کی چند درخشندہ خوبیوں کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مجھے بہت اچھی طرح کی توقع ہے
اگر انکی قابلیت اور معقولیت کا مجھے اندازہ نہ ہوتا تو میں ان کے
تقرر کی سفارش دینے کی جرأت نہ کرتا۔

رشید احمد صدیقی

Muslim University
Aligarh.
26. 1. 1941

Mr. Hasan Abdullah was a student of the Aligarh Muslim University and member of the Hall under my charge from 1936 to 1938. Before he joined this University he had passed the LL.B. Examination of the Allahabad University and practiced as an Advocate at Barabanki and Ghazipur for several years. Here he studied Urdu as a student of the M.A Class for two years and at the close of this period he took his M.A Degree securing a second class.

Mr. Hassan Abdullah is a young man of character. He is active and has an impressive personality, a stately bearing and an exceptional charm of manners. During his stay in Aligarh he endeared himself to all those who came in contact with him. He belongs to a very respectable family of Ghazipur, many members of which have rendered distinguished and loyal services to the British Government. His father, who is a member of Court of this University, retired from Government service as Assistant-Director of Public Instruction in the U.P. He also served the Government of Kashmir as Director of Education.

I am confident that with his excellent intellectual and moral equipment, Mr. Hasan Abdullah will do exceedingly well in any position of trust and responsibility.

M. M. Sharif

M.A. (Centab).
Reader in Philosophy, and
Ex – Provost of Sir Syed Hall.

TRUE COPY

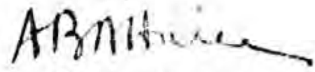
Pro – Vice – Chancellor.

Muslim University
Aligarh.
January 27, 1941.

Mr. Hasan Abdullah after taking his B.A.and LL.B degree from the Allahabad University and practising as an Advocate at Barabanki and Ghazipur, joined the post-graduate class of the Aligarh Muslim University in July 1936 and passed his M.A examination in Urdu in the 2nd Division in 1938. In September of the same year he proceeded to England for higher studies and joined the Ph. D. class of the School of Oriental Studies, London, but unfortunately owing to the war could not complete his Thesis there.

I have known Mr. Hasan Abdullah personally for several years and have formed a very good opinion of his character and capacity. He is well-bred, intelligent and hardworking and possesses, to the best of my knowledge, an excellent moral character. He was always regular in his studies, enjoyed the esteem of his teachers and exercised a healthy influence over his fellow students.

I always found him straightforward and reliable and he distinguished himself by his devotion to the University. From all that I know of Mr. Hasan Adbullah I can recommend him unhesitatingly for a post of trust and responsibility.



DM,

ABA Haleem
Pro – Vice – Chancellor.

I gladly endorse the certificate given by the Pro – Vice – Chancellor, as to the high qualifications, great capacity for work, and excellent character of Mr. Hasan Abdullah, who is personally known to me. He created a very good impression during his University career, not only on his fellow students but also on his teachers.



My dear Kazi Khuda Buksh,

I am forwarding the application of Mr. Hasan Abdullah, for the post of a Lecturer in Urdu in your College from the next Session.

He is an Old Boy of this institution, and he comes of a highly respectable family of these Provinces. He took his M.A. Degree In Urdu in 1938, in second division from this University, and joined PH.D. Course in the School of Oriental and African Studies at London, where he did Research in Urdu for full three Terms. His thesis is ready but he could not submit it to the University of London due to the-untimely out-break of the war in Europe.

He is a very conscientious and amiable young man, and a Musalman with firm beliefs. I have personally known him for years and from my very intimate knowledge of him I certify that he bears an excellent moral character. He possesses sound knowledge of his subject. He has taught Urdu and Persian to the Intermediate and Degree classes in the Agra College, Agra, and the Principal seems to have formed a high opinion about his capabilities and conduct.

I shall be glad if you can accommodate him in your College. He will accept any reasonable salary, and I am confident that he will satisfy you with his good work and painstaking qualities.

Yours Sincerely,

(Dr Ziauddin)

Kazi Khuda Buksh Esqr.,
Sind Madrasa,
Karachi.

(FORM NO. 24)

University School of Law

Allahabad January 19, 1929

Senate House

I know Mr Hasan Abdullah who was a pupil of mine in the Previous LLB Class last year. My impression of him is that he was a very good student,- intelligent, attentive and industrious. His behaviour in the class was all that could be desired. He was gentle, polite and respectful, he has an excellent character and he can be implicitly trusted in any position of responsibility. I am sure he will discharge his duties efficiently, honestly and independently.

Reader in Law

Lucknow:
November 2, 1933.

Mr Hasan Abdullah has been known to me ever since his boyhood. His father Mr. Abul Hasan, I.E.S (retired) served with distinction for a long time in the Education department of these Provinces. His family is an excellent one and has always commanded the confidance and respect of both the communities as well as the authorities in the Ghazipur district. Many members of this family have been in Government service and also posses landed property. The whole family is perfectly loyal.

Sd. AINUDDIN, M.B.E.
Under Secratory to the
Local Self-Government, U.P



TRUE COPY.

Asst. Collr. I Class

CERTIFICATE OF RESPECTABILITY

I certify that Hasan Abdullah belongs to a highly respectable family of big Zamindars of this district and that some of his ancestors have served the Government very well in the past, while several of his relatives hold responsible posts under the Government today.

Dated: 30, 7, 1930

Sd. E. de V. Moss,
District Officer,
District Ghazipur.

TRUE COPY.

Asst. Collr. I Class

COLLECTOR, I CLASS
ALIGARH

Muslim University
Aligarh.
26, 1. 1941

Mr. Hasan Abdullah was a student of the Aligarh Muslim University and member of the Hall under my charge from 1936 to 1938. before he joined this University he had passed the LL.B. Examination of the Allahabad University and practiced as an Advocate at Barabanki and Ghazipur for several years. Here he studied Urdu as a student of the MA class for Two years and at the close of this period he took his M.A degree securing a second class.

Mr. Hasan Abdullah is a yound man of character. He is active and has an impressive personality, a stately bearing and an exceptional charm of manners. During his stay in Aligarh he endeared himself to all those who came in contact with him. He belongs to a very respectable family of Ghazipur, many members of which have rendered distinguished and loyal services to the British Government. His father, who is a member of Court of this University, retired from Government service as Assistant Director of Public Instruction in the U.P. He also served the Government of Kashmir as Director of Education.

I am confident that with his excellent intellectual and moral equipment, Mr. Hasan Abdullah will do exceedingly well in any position of trust and responsibility.

M.A. (Cantab).
Reader in Philosophy, and
Ex – Provost of Sir Syed Hall.

TRUE COPY.

Asst. Collr. I class
Aligarh
6.3.44

COLLECTOR, I CLASS
ALIGARH

H. KRALL, B.A., M.Sc., DIP. Ed., F.I.C.,
PRINCIPAL.

AGRA COLLEGE,
AGRA
2nd. May, 1941

Mr. Hasan Abdullah joined our Staff as a temporary Lecturer in Urdu and Persian in July 1940. He taught these subjects to both Intermediate and Degree classes. His work was very satisfactory. He has high qualifications in his subject and as teacher is regular and painstaking.

He is a courteous and good-humoured colleague, and gets on well with both students and staff. He is ever ready to undertake any extra duty allotted to him and I have formed a very high opinion of him.

Sd/ . H. KRALL
Principal.

TRUE COPY.

Magistrate, Ist. Class,
Aligarh.



It is to certify that M. Hasan Abdullah has personally been known to me for a considerable length of time. I have never found an occasion to complain against his behaviour. He belongs to a very respectable family. He is an intelligent, energetic, honest, conscientious, and amiable young man: and in my opinion, he is capable of handling labour to the satisfaction of his employers. He has been a member of the Tennis first net in the Muslim Hostel of this University.

Sd / . Syed Muhd. Ali Nami,
M.A., P.E.S. ,

Head of the Department of
Persian and Arabic,
&
Superintendent of the Musalman
Boarding House.
University of Allahabad.

University School of Arts.

The30th.September.1928

TRUE COPY.

Magistrate First Class
Aligarh

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.
ALIGARH.

April 6, 1938.

Mr. Hasan Abdullah has been my student since 1936. he has just appeared for his M.A. Examination, and I hope he will secure a very good class.

Mr. Abdullah is a keen and enthusiastic student of literature, and the range of his interests is wide. He has not confined himself to the text-books only. I was greatly impressed with the quality of written work which he showed me in the course of these two years. He is eminently fitted for Research work as he is a good scholar of Persian also. His character is excellent.

I hope he will prove an asset in any walk of life he chooses for himself.

A. A. Suroor

(Aal Ahmad Suroor)
Lecturer.

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.
ALIGARH.

R.A. SIDDIQI
CHAIRMAN

April 6, 1938.

Mr. Hasan Abdullah joined our M.A. Previous class in Urdu, in July 1936. He has recently appeared in the M.A. Final Examination of 1938, and I am confident of a very good division in his case.

From the outset Mr. Abdullah showed very keen interest in his subject, and made an extensive study of Urdu Literature. He proceeded with a systematic analysis of the various periods of Prose and Poetry, and supplemented Class-work with well written Essays. He undertook a special study of Sir Syed and his contemporaries in Prose, and of the age of Ghalib in Poetry. The work that he did in the preparation of these two papers was eminently satisfactory, and marked him out as particularly suited to research work.

I now understand that he is proceeding to London for further studies, and I think that he is very well advised in doing so. I am confident that the standard that he has attained already will enable him to profit by the Ph.D. Course, and that he will do very well in Research work.

Mr. Abdullah came to Aligarh with a mature mind and he utilized his stay here to the full. His conduct has been thoroughly satisfactory, his manners are excellent, and I have enjoyed teaching him. I am sure he will give a good account of himself wherever it is his lot to find himself placed.

R. A. Siddiqi

(Rasheed Ahmed Siddiq)

MINISTER LOCAL SELF GOVT.-UNITED PROVINCES

I know M. Hasan Abdullah, B,A. , son of M. Abul Hasan, I.E.S. , personally. He belongs to a very respectable family of Ghazipur District.

He is a graduate of the Allahabad University and took his degree in the second division.

I certify that he is an intelligent, smart and promising young man and I wish him success in every walk of life.

Hon. Nawab,
Bar-at-Law,
Minister, L.S.G.,U.P.

2.11.28.

I know M. Hasan Abdullah, B.A. personally; and his father, M. Abul Hasan, I.E.S, , being an intimate friend of mine. I had occasions to come in close touch with him. He belongs to a very respectable family of the Ghazipur district. I certify that he is of excellent moral character, and also that he is an intelligent young man with honest intentions. I am glad to add that I have nothing to say against him.

ARaoof Kt.,

ALLAHABAD,

The 3rd, OCT. , 1923

Bar – at – Law

Ex – Judge of the Hon 'bie
Lahore High Court.

SCHOOL OF ORIENTAL STUDIES.
(UNIVERSITY OF LONDON)

VANDON HOUSE,

VANDON STREET,

LONDON. S.W.I.

WHITEHALL. 4735

19 May 1939.

THIS IS TO CERTIFY that Mr. Hasan Abdullah is a registered internal student at this School. He has leave to go back to India at the end of this Term and will be returning to this School at the opening of the 3rd Term of next Session, i.e. at the end of April 1940.

M. A. E. Beavis

Registrar.

(FORM NO. 24)

University School of Law.

Allahabad 29th July, 1930

Senate House

I know Mr. Hasan Abdullah who was a pupil of mine in both the Previous and Final LL.B. Classes. My impression of him is that he was a very good student, intelligent, attentive and industrious. His behaviour in the class was all that could be desired. He was gentle, polite and respectful. He bears an excellent character and he can be implicitly trusted in any position of responsibility. I am sure he will discharge his duties efficiently, honestly and independently.

Reader - in - Law

تعزیتی قرارداد

مسلم یونیورسٹی کورٹ کا یہ جلسہ مسٹر حسن عبداللہ کے انتقال پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔مرحوم نے یونیورسٹی کی خدمت بحسن وخوبی انجام دی۔ یہ جلسہ دست بہ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔آمین

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سالانہ بجٹ میٹنگ (کورٹ) بتاریخ 20 اپریل 1947ء رامپور حامد حال میں منعقد ہوئی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر کی زیرِ صدارت تقریباً 85 اراکین جن میں یونیورسٹی سے متعلق انتہائی نامور اور معزز شخصیات نے شرکت کی۔جن میں چند کے نام یہ ہیں:

جناب اختر عادل، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، جناب رشید احمد صدیقی، نواب اسمٰعیل خان، جناب خواجہ ناظم الدین، جناب جی اے مدنی، جناب اے بی اے حلیم، جناب مولوی ابوالحسن (والد) جناب لیاقت علی خان، نواب صدر یار جنگ، جناب حبیب الرحمٰن شیروانی، شفاء الملک، حکیم عبدالمعید صاحب۔



ایڈیٹوریل۔ایک صالح جوان کی موت

ہم نے دلی رنج وافسوس کے ساتھ سنا کہ حاجی مولوی ابوالحسن صاحب پنشنر انسپکٹر مدارس ممالک متحدہ وسابق ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم ریاست کشمیر کے فرزند اکبر حسن عبداللہ مرحوم نے بمقام علی گڑھ ایک ہفتہ علیل رہنے کے بعد سفرِ آخرت اختیار کیا۔ مرحوم نے الٰہ بادیونیورسٹی سے بی اے ال ال بی کے بعد علی گڑھ سے ایم اے کی ڈگری لی۔ بعد میں ڈاکٹری کرنے کے لیے انگلستان گئے۔ دوبرس کی تعلیم کے بعد ایام تعطیل میں ہندوستان واپس آئے تھے جب کہ جنگ چھڑ گئی وہ ڈگری لینے کے لیے پھر انگلستان نہ جاسکے۔

طالبعلمی کے زمانے سے ہی مرحوم نہایت نیک، صالح، پابند مذہب اور سعادت مند تھے۔ قیامِ انگلستان میں مرحوم نے ایک یہودی کے یہاں قیام کیا اس لیے کہ یہودیوں کے مذہب میں ذبیحہ کا گوشت استعمال ہوتا ہے اس کے علاوہ مرحوم نے نماز روزہ ودیگر فرائض مذہب کا نہایت سختی سے ساتھ خیال رکھا۔

انگلستان سے واپسی کے بعد مرحوم نے انگریزی طرزِ معاشرت کو اختیار نہیں کیا بلکہ وہ سادہ ہندوستانی لباس استعمال کرتے رہے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ وہ اسلامیہ اسکول اٹاوہ کی خدمت کریں اس لیے انہوں نے کچھ عرصہ تک اسکول میں آنریری طور پر ماسٹری کے فرائض انجام دیے لیکن سررشتہ تعلیم کے قواعد کے بموجب وہ ٹرینڈ نہیں تھے اس لیے انہیں اسکول چھوڑ نا پڑا

چونکہ مذہب اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کا میں دلدادہ ہوں اور آج کل خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ سے یہ چیزیں بالکل ختم ہوتی جارہی ہیں اس لیے قدرتاً مجھے ہر اس نوجوان سے محبت ہے جو اپنی تہذیب اور مذہب کا شیدائی ہے۔ مرحوم میں چونکہ دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں اس لیے مجھے مرحوم سے دلی لگاؤ تھا۔ لیکن مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ خدا مرحوم کے والد کو زندہ رکھے اور وہ مسلمانوں کی تعلیمی خدمات انجام دیتے رہیں۔ مرحوم کی بیوی بچوں اور ماں باپ کے ساتھ میں دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں خدا ان سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو آغوشِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

نوٹ : ذیل کا مضمون مرحوم کے حالاتِ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ یہ مضمون کانفرنس گزٹ علیگڑھ میں چھپا تھا۔ اس کی نقل ان بزرگوں و قدردانوں کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے جو مرحوم و مغفور کی علمی قابلیت، صداقت، سیاست اور اخلاق کے معترف و مداح رہے ہیں اور جو اُن سے اُن کی زندگی میں بھی محبت کرتے تھے اور آج بھی درگاہِ باری تعالیٰ میں ان کے لیے دست بہ دعا ہیں۔ قَالُوْا اِنَّ لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن

مسلم یونیورسٹی میں ایک اندوہناک حادثہ

نہایت رنج و ملال سے لکھا جاتا ہے کہ ۱۴ ستمبر ۴۶ء کی صبح کو مولوی حسن عبداللہ صاحب ایم اے (علیگ) ایل ایل بی اسٹیوارڈ مسلم یونیورسٹی نے کم و بیش ایک ہفتہ کی علالت کے بعد چالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حسن عبداللہ صاحب مرحوم جناب مولوی حاجی ابوالحسن صاحب سابق ڈائریکٹر تعلیمات ریاست کشمیر و ممبر اگزکٹو کونسل مسلم یونیورسٹی کے خلف الرشید تھے۔ انہوں نے بی۔اے کا امتحان گورکھ پور کالج سے اور قانون کا الہ آباد سے پاس کیا تھا۔ اس کے علاوہ آپ مسلم یونیورسٹی کے ایم۔ اے بھی تھے اور اپنی قابلیت و ذہانت کے لحاظ سے ہم عصروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

مرحوم کی خانگی تربیت ایسی فضا اور ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں قدیم مشرقی علوم و تہذیب اور مشرقی و اسلامی روایات کو ایک خاص عظمت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود جدید تعلیم سے مستفید ہونے کے وہ اپنے خیالات و افکار اور ذہنیت و سیرت نیز دوسرے خصائل کے اعتبار سے موجودہ دور کے تعلیم یافتہ نوجوان سے بڑی حد تک مختلف تھے۔ وہ ایک خوش عقیدہ مسلمان تھے اور مذہبی فرائض پوری سرگرمی سے ادا کرتے تھے، بلکہ اپنے حلقہ اثر میں دوسرے لوگوں کو بھی مذہبی احکام کی پابندی کی ترغیب دیتے تھے۔

قانون کے امتحان سے فارغ ہونے اور ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد آپ نے ضلع

بارہ بنکی میں پریکٹس شروع کردی لیکن اپنی ذہانت و احتیاط کی وجہ سے اس پیشہ کو اپنے لیے مناسب و موزوں نہ پاکر ترک کردیا اور گزشتہ جنگِ عظیم سے پہلے اُردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچنے کے کچھ مدت بعد جنگ چھڑ گئی اور آپ ہندوستان واپس آ گئے۔ مرحوم کو درحقیقت تعلیم کے پیشہ سے مناسبت تھی اور تعلیمی شعبہ میں کام کرنے کا بہت شوق تھا، لیکن افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور اس کی نوبت نہیں آئی۔

انگلستان سے واپسی کے بعد مسلم یونیوٹی سے آپ کا تعلق پیدا ہوگیا اور کنٹرولر کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اُس کے بعد حسن کارگزاری کی بنا پر اسٹیوارڈ کے عہدہ پر تقرر رہوا۔ ان دونوں خدمتوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ایک بے اُصول وغیر متدین شخص تنخواہ کے علاوہ ہزاروں روپیہ کما سکتا تھا۔ اور وہ بھی ایسی تدبیروں سے کہ کسی کو گرفت کا موقع نہ ملے لیکن مرحوم اس سے کہیں بالاتر تھے اُنہوں نے اپنے فرائض وقواعد کی پوری پابندی کے ساتھ ایسی دیانت و امانت کے ساتھ ادا کیے جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یوں تو وہ ذاتی طور پر بڑے بامروّت و سیر چشم تھے اور اپنے احباب و متعلقین کی ہر خدمت کے لیے تیار رہتے تھے، لیکن اپنے عہدے کے فرائض ادا کرتے وقت وہ بالکل بدل جاتے تھے۔ ممکن نہیں جو ذرا بھی کسی معاملہ میں کوئی رعایت کریں ان کی اس بے لاگ دیانت داری سے بعض اوقات لوگوں کو شکایت بھی پیدا ہوجاتی تھی، لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھے۔ جب ان کے اس طرزِ عمل سے کوئی ناخوش ہوجاتا تو وہ اس سے معافی مانگتے تھے مگر اپنے طریقہ میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے تھے۔

مرحوم کی ایک نمایاں خصوصیت اُن کی اخلاقی جرأت تھی، نہایت صاف گو اور بیباک تھے جس بات کو ٹھیک سمجھتے تھے، بے دھڑک کہہ دیتے تھے، نتیجہ کی پروانہیں کرتے تھے نہ مصلحت و موقع دیکھتے تھے، بعض دفعہ لوگ ان کے اس طرزِ عمل سے حیران رہ جاتے تھے مگر وہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور تھے، صاف گوئی کی یہ خوبی اُن میں مذہبی تربیت کے اثر سے پیدا ہوئی تھی مذہب کا ان کی شبانہ روز کی زندگی پر زبردست اقتدار تھا اور اس معاملہ میں وہ ایک کٹر مولوی کی طرح متشدد تھے۔

اپنے خاندان اور احباب کے ساتھ مرحوم کا سلوک بہت اچھا تھا وہ ہر شخص کے دُکھ درد میں شریک ہوتے اور ہر خدمت کے لیے تیار رہتے تھے۔ مطالعہ کا ذوق تھا اپنے ''مذہبی معلومات''

میں برابر اضافہ کرتے رہتے تھے اور ضرورت کے موقع پر پورے جوش سے مذہبی تقریریں کرتے اور آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ بیان کرتے تھے اپنے بیان میں قرآن مجید کی آیات اور تاریخی روایات کا حوالہ دیتے تھے۔ ادب کا بھی اچھا خاصہ ذوق تھا۔ علی گڑھ کی مجلس مصنفین کے ممبر تھے جب موقع ملتا تو مجلس میں مقالہ پڑھتے اور علمی مباحث میں لیتے تھے۔

مرحوم کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ باوجود مسلم یونیورسٹی کی تعطیل کے نماز جنازہ میں مسلمانوں کی کثیر تعداد شریک ہوئی، حالانکہ جنازہ لے جانے میں عجلت کی گئی اس لیے بہت سے اصحاب کو خبر نہیں ہوسکی۔ نمازِ جنازہ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں ہوئی اور دوپہر سے پہلے تدفین عمل میں آئی۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کی صبح کو مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی ہوئی یہاں بھی کثیر مجمع تھا۔ ہر طبقہ کے مسلمان موجود تھے وائس چانسلر صاحب مسلم یونیورسٹی نے بھی دہلی سے آکر نمازِ جنازہ اور قرآن خوانی میں شرکت کی تعزیت کرنے والوں کی آمد کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور والدین وعزیزوں کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے مرحوم کے والد مولوی حاجی ابوالحسن صاحب نے اس صدمہ جانگداز کو جس حیرت انگیز صبر و استقامت اور جس قوتِ ایمانی کے ساتھ برداشت کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ واقعہ کی نوعیت ایسی ہے کہ علی گڑھ میں ہر شخص کو اس صدمہ میں مرحوم کے والدین سے گہری ہمدردی ہے، وہ اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے۔ مرحوم نے اپنی یادگار میں کئی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے ہیں جن سے خاندان کی ساری اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ہفتہ وار تعلیمی اخبار



جلد 47 میں 16 دسمبر 1946ء رشید احمد صدیقی کا تعزیتی مضمون شائع ہوا جو بعد میں گنج ہائے گرانمایہ میں شامل کیا گیا۔

اسی گزٹ میں حسن عبداللہ کی نظم جو تضمین تھی جناب فضل احمد کریم فضلی کی وہ بھی شائع ہوئی۔

ہماری اماں کے نکاح کے موقع پر نانا کی جانب سے دعوت نامے کا عکس جو فارسی زبان میں ہے۔ محفوظ کرنے کی غرض سے شاملِ اشاعت ہے۔

مُرتّب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

چمن چمن ستایش بہار آفرینے را کہ ریاحین رنگا رنگ انواع عالم در چار چمن عناصر بیک نسیم کن شگفانیدہ و گلشن گلشن نو راہان برینی زندشِ نخلبند گلستان نبوت را کہ حبیب و دامن جہانیان رابگلہہائے مرادات دو عالم بہتر از چمن در بہار گردانیدہ۔ سپس شادانی را صلا کہ باہتزاز بادِ بہاری عنایات باری درخیابان یاز دہم جمادی الاوّل ۱۳۴۶ھ اطراف روش روز دوشنبہ مطابق ۷ نومبر ۲۷ء گل تقرر تاریخ عقد نکاح صبیۂ این احقر البریہ برشگفتہ نظارتِ نگاہ آرزو شدہ شکر این موہبت رامجلسے تشریف بزرگان وعزیزان تراج دعائے نکوسرانجامی باد۔

بیا کہ فرش رہت چشم خانہ آبادی ست
بیا کہ آمدنت غازہ رخ شادی است

المکلف

بندہ احقر سیّد علی ظفر از سلیم پور

(C.P.O.)

مہمانِ اعزازی

ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب
سی آئی ای
ایم ایل اے

ہمارے نانا سیّد علی ظفر ہاشمی سلیم پور ضلع غازی پور کے معزز زمیندار اور علمی اور دینی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کسی تقریب میں ان کے یہاں تشریف لائے۔ دعوت نامہ ہمارے پاس محفوظ رہا مگر افسوس اس پر تاریخ اور موقعہ درج نہیں۔ شاید اس کا صفحۂ اوّل بھی رہا ہو جو ہم تک نہیں پہونچا۔ اسے شامل کرنے کا مقصد ایک تو تاریخ کو محفوظ کرنا ہے دوسرا یہ کہ اس زمانے کا طرز سامنے آتا ہے کہ دعوت نامے میں کھانے کی تفصیل بھی شامل ہے۔ اور کھانے کے نام بھی ایسے جواب اس نام سے موجود نہیں دلچسپی کی خاطر نذرِ قارئین ہے۔

ماحضر

۱۔ نان ہندی
۲۔ نان ورقی
۳۔ سنبوسہ بے سن
۴۔ غرقابی
۵۔ قورمہ بادامی
۶۔ مرغ برکت پسند
۷۔ چشم نرگس
۸۔ لحم پارہ
۹۔ بریانی تورانی
۱۰۔ بورانی خاقانی
۱۱۔ یاقوتی ضیاء پاش
۱۲۔ قوام نارنج
۱۳۔ برفآبی
۱۴۔ قاش صد پارہ
۱۵۔ میوہائے سربستہ

حُسنِ حسنؔ

❁ میٹرک 1922ء گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ اسکول جھانسی یوپی

❁ انٹر 1924ء گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ اسکول جھانسی یوپی

❁ بی اے 1927ء سینٹ جانس کالج آگرہ۔الہٰ بادیونیورسٹی

❁ ایل ایل بی 1930ء الہٰ بادیونیورسٹی

❁ ایم اے 1938ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

❁ پی ایچ ڈی اسکول آف اورینٹل اسٹیڈیز۔لندن
دوسری عالمی جنگ کے باعث علی گڑھ واپس آئے
یہاں بقیہ مقالہ مکمل کیا لیکن 14 ستمبر 1946ء کو انتقال
ہوگیا اور ڈگری لینے لندن نہ جاسکے۔

❁ ملازمت:۔ ایڈوکیٹ 38-1931ء تک بارہ بنکی اور غازی پور
تدریس.........اٹاوہ اُستاد فارسی، اردو
سینٹ جانس کالج آگرہ۔اُستاد فارسی، اردو
کنٹرولر اسٹیوارڈ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی



مطبوعات

❁ مثنوی فروغِ بزم یعنی جوہرِ مکنونِ شریعت 1941ء
مطبوعہ : اختر پرنٹنگ ورکس علی گڑھ

❁ مثنوی بادِ مخالف 1945ء
بحیثیت اسٹیوارڈ مسلم یونیورسٹی

❁ مثنوی خدمتِ مامورہ۔1942ء سیاستِ امین الامم ملتِ اسلامیہ
مطبوعہ : ہندوستانی پریس غازی پور

❁ نظم مجاہد
جلسہ عام میں پڑھنے پر حاضرین نے مجاہدِ ملت کا خطاب دیا۔